U13580 Dut-28-12-09

Title — HAYAAT-E-MOMIN MASAMMA BA TAREEKH-E MOMIN

Creator — Zameer uddin Ahmad Arsh.

Publisher — Sayyed Ishtiyaq Hussain Shauq (Delhi).

Date — 1347 H.

Pages — 144

Subjects — Momin Khan Momin — Sawaneh-o-Tanqeed; Tazkira — Momin Khan Mom

ان من الشعر لحکمۃ و ان من البیان لسحرا

هو الباقی

حیاتِ مومن

مسمّٰی بہ

تاریخ مومن

۷ھ ص ۱۳

ظہورِ زمان یعنی حکیم مومن خان صاحب مرحوم دہلوی کے باتصویر سوانح

مؤلفہ

مشہور دیار و مصار میر بہار جناب ضمیر الدّین احمد صاحب عرشؔ متوطن شہر گیا

یادگار تسلیم و مومن

حسبِ فرمائش

سیّد اشتیاق حسین شوقؔ نبیسہ حضرت ظہیرؔ دہلوی مرحوم بازار ڈیبہ کلاں دہلی

قیمت بیس شیشی تیرہ روپیہ ۸/-

فی شیشی ایک روپیہ ۸/-

روغن داد

نئے اور پرانے داد کی لاثانی دوا

داد ایسی خبیث بیماری ہے کہ یونانی اور ڈاکٹری کسی دوا سے اسکی بیخ و بنیاد نہیں جاتی مگر ہمارے ایجاد کردہ روغن داد کے چند روزہ استعمال سے ہر قسم کا داد نیا ہو یا پرانا انشاء اللہ تعالیٰ بالکل صاف ہو جائیگا۔ اس روغن میں خاص خوبی یہ ہے کہ اسکے استعمال سے کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوتی۔ سو میں ۹۰ مریض کامیاب ہو چکے ہیں۔ بنائے علیہ عالیجناب مسیح الملک کے بھادر کے بھانجے اور ہندوستان کے شہرہ آفاق طبیب عالیجناب شمس الاطباء حکیم غلام کبریا خان صاحب عرف بھورے خان صاحب نے اپنے مطب میں چھ ماہ تجربہ کرکے براہ عنایت حسب ذیل سارٹیفکٹ عطا فرمایا ہے جو روغن داد کے مفید ہونے کی کافی ضمانت ہے۔

"میں تصدیق کرتا ہوں کہ روغن داد تیار کردہ منشی سید اشتیاق حسین شوق دہلوی۔ داد کے لئے نہایت فائدہ مند ہے۔ اکثر مریضوں پر استعمال کیا نہایت مفید ثابت ہوا۔"

دستخط غلام کبریا خاں

اسکے بہتر فوائد کا سچا اشتہار یہ ہے۔ ہندوستانی دواخانہ دہلی جو عالیجناب مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب کی سرپرستی میں ہے یہ روغن داد اسی سبب سے ملک کے سب سے بڑے دواخانہ میں بھی فروخت ہو رہا ہے۔

موجد سید اشتیاق حسین شوق۔ دریبہ کلاں

دہلی

حکیم مومن خان صاحب مومن دہلوی



مدت سے نام سنتے تھے مومن کا بارے آج
دیکھا بھی ہم نے اس شعرا کے امام کو

فہرست مضامین

التماس ناشر

محسن و محترم ذو المجد والکرم جناب حکیم مولوی محمد جمیل خانصاحب
رئیس اعظم دہلی نے تاریخ مومن کا مسودہ مجھے عطا کر کے اس کی تیاری
اور طباعت کا حکم دیا حضرت حکیم صاحب کا حکم حضرت مومن سے
عقیدت اور پھر ذاتی مفاد کی توقع ہیں دل وجان سے اس طباعت
کی انجام دہی کیلئے آمادہ ہوگیا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ یہ قلمی مسودہ
اب خوشنما کتابی صورت میں ناظرین کرام کے روبرو پیش کیا
جا رہا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ اسے خدمت اُردو کی طرف
ایک قدم سمجھکر ارباب ذوق میری حوصلہ افزائی فرمائینگے اور
میری ناچیز کوششیں قبولیت کا شرف حاصل کرینگی ۔

خاکسار
سید اشتیاق حسین شوق
دھلوی

ازمصنف

نقش ہے سنگِ آستاں پہ ترے

داستان اپنی جبہ سائی کی

خاکسار عرشؔ کا دل جانتا ہے کہ اُسنے اس کتاب کے چھپوانے کی کیا کیا راہ نہ نکالی اور کن کن اُمرائے با مذاق کو نہ لکھا مگر ہر طرف سے محرومی ہوئی بالآخر الہام غیبی ہوا کہ تو فخر حکمائے ہندوستان سرتاج اُمرائے عالیشان رئیسِ بلند اختر صاحبِ علم و ہنر عالی جناب علاّمہ حکیم محمّد جمیل خاں صاحب خلف الرشید عالی جناب مسیح الملک ارسطوئے زماں حکیم اجمل خاں صاحب نور اللہ مرقدہٗ رئیس اعظم دہلی کو لکھ۔ چنانچہ ان کی واحد ذات نے میری درخواست کو منظور فرمایا اور اس کتاب کو چھپوانے کا وعدہ کیا۔ اب اس کو اُنکے نامِ نامی و ذاتِ گرامی کے ساتھ معنون کرکے دست بدعا ہوں کہ خداوندِ عالم ان کو حیاتِ ابدی و اقبالِ سکندری عطا فرمائے اور اس کتاب کو مقبولیتِ عام عطا کرے۔ آمین ثم آمین

ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ زر ہم

تحسینِ سخن فہم ہے مومنؔ صلہ اپنا

الفقیر الفانی ہیچمدان عرشؔ رحمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

اُردو بیگم (نظم) کی کہانی آپ اُن کی زبانی

سلسلۂ شاعری مومن کی آئین

دیباچہ

”یوں تو از دعوئے سعلی کا لال قلعہ میری رنگا رنگ پچکاریوں سے سرتا پا مزین ہے اور اسکے رہنے والے یعنی زبان دان۔ اساتذہ دہلی و لکھنؤ ان جگمگاتے ہوئے بیل بوٹوں سے دلفریبی حاصل کرتے ہی رہتے ہیں مگر انکی آنکھیں صانع کو نہیں ڈھونڈھتیں نہ ان گلکاریوں کے موجد کی ان کو خبر ہے۔ یہی حال چمنستان فصاحت و بلاغت کے گلچین کا ہے کہ وہ تر و تازہ پھولوں سے اپنے دامن کو اندھا دھند بھرتا چلا جا رہا ہے گلدستے تیار کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے مگر اسکی نظر صرف قدردانوں اور خریداروں پر ہے یہ نہیں دیکھتا کہ پردۂ بہار میں آخر وہ کونسا طوطیٔ خوش الحان زمزمہ پرواز ہے جس کے سامنے بلبل خوش نوائے شیراز بھی دم بخود ہے۔“

لو میں آج چہرے سے برقع اٹھائے دیتی ہوں اور تذکرہ مومن کے پردۂ زرنگار سے الگ کے ہٹتی اور اپنی کہانی تمہیں آپ سناتی ہوں ذرا کان لگا کر سننا اور یاد رکھنا کہ نظم اردو کی باقاعدہ نیو کب پڑی اور کسطرح اس کی سلسلۂ مومن میں نشو و نما ہوئی۔ پرانی تاریخ سے بھی چاہو ملا لو۔ راسخ عظیم آبادی۔

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے
پلک پر اپنے آنسو صبح پیری کا ستارا ہے

آغازِ داستان

عالمگیر کا آخری عہد تھا کہ میں احمد آباد گجرات میں پیدا ہوئی نصیب کا لکھا کہ میری ماں میرے پیدا ہونے کے چند ہی دن بعد مر گئیں صرف ابا جان جنکا نام شمس ولی تھا رہ گئے تھے اُنپر اس حادثہ جانکاہ کا ایسا اثر پڑا کہ برخواستہ خاطر ہو کے مجھے کلیجے سے لگائے ہوئے وطن سے نکل پڑے خدا بخشے ابا جان تخلص کے ولی نہ تھے بلکہ واقعی وہ اپنے عہد کے ولی اللہ تھے جو بات انکے منہ سے نکلی پتھر کی لکیر ہو گئی اونکی اوقات یاد الٰہی میں بسر ہوتی تھی اونکو خاندان کے بزرگوں کا فیض تھا کیونکہ وہ سید شاہ وجیہ الدین اور شیخ نور الدین صدیقی وحضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی اولاد میں تھے غرض جب یہ گھر سے نکلے تو سیدھے دلی آئے دلی میں اسوقت بڑے بڑے مشائخ موجود تھے شہر کا شہر تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا تھا یہ محمد شاہی عہد سنہ کی بات ہے میں اسوقت محض شیر خوارگی کے عالم میں گہوارے پر تھی۔ یہ ابا جان اور بزرگانِ سلسلہ کی کرامت کہئے کہ میں آج تک وہ باتیں یاد ہیں۔ ابا جان اور ناصر علی ایک ہی عہد میں تھے اور ہر چند کہ اسوقت ہر فن کا اہل دربار شاہی کے طرف رجوع تھا مگر ایک ابا جان کی ذات تھی کہ اونکی درویشانہ وضعداری کے ساتھ توکل مرتے دم تک اپنی حالت پر برقرار رہا۔ ہاں جب انکا دم گھبراتا تھا تو کچھ شعر کہکر اپنا دل بہلا لیتے تھے۔ اُسی عہد میں جب بادشاہ کے طرف سے یہ تفتیش ہوئی کہ یہاں قیام کی وجہ کیا ہے تو یہ فرمایا تھا کہ ؎

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین ‏ ‏ ‏ جا کہو کوئی محمد شاہ کون

دکن کی جگہ اوسوقت فصحا کون بولتے تھے) غرض یہ دلی میں کچھ ایسے آئے اور ایسے بیٹھے کہ مر کے اُٹھے۔ یہاں ہزاروں اُنکے شاگرد اور لاکھوں انکے پیرو ہوئے مگر اہل اور نامی تلامذہ میں شاہ حاتم سے بہتر کوئی نہ ہوا جنکو شاگرد کیا وہ سپوت ولا کہلاتی جنہوں نے

اباجان کے بعد مجھے بے ماں در شپ رجان کر اپنی بہن کی طرح اور سچ پوچھو تو میں نے انہیں کے گھر ہوش بھی سنبھالا ۔ اسی زمانہ میں ہمنے مرزا رفیع سودا کو پایا یہ شاہ صاحب کے بہترین تلامذہ میں تھے وہ میری بڑی عزت اور خاطر کرتے تھے مگر افسوس کہ ابھی شاہ حاتم زندہ ہی تھے کہ یہ آصف الدولہ کے یہاں لکھنو چلے گئے اور ایسے گئے کہ وہیں کی خاک کے پیوند ہو گئے ۔ شاہ حاتم کو بوڑھاپے میں اس پہلوان سخن کی موت کا بڑا صدمہ ہوا سچ ہے انکا اکھاڑہ سونا ہو گیا وہ اکثر روتے رہتے تھے اور ہاتھ مل مل کے سودا کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے ۔

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

واقعی اگر سودا زندہ رہتے اور کہیں شاہ حاتم پہلے مر جاتے تو وہ مجھے ضرور سودا کے سپرد کر جاتے مگر حکم خدا تو یوں تھا کہ بوڑھے بیٹھے ہیں اور جوان اٹھ جائیں غرض جب شاہ صاحب دنیا سے سدھارنے لگے تو شیخ قیام الدین قایم شاگرد سودا کو بلوایا اور کہا کہ افسوس اپنے وقت کے آگے سودا چل بسا اب تمکو وصیت کرتا ہوں کہ اردو بیگم کو اپنے ساتھ رکھنا اور ہر طرح انکی دلجوئی کرتے رہنا ورنہ میدان حشر میں مجکو ولی کے سامنے منہ چھپانا پڑے گا ۔ چنانچہ اس کہنے کو انہوں نے بسر و چشم منظور کیا ۔ میاں قایم چاند پور کے شریف زادہ تھے دلی میں آکے بس گئے تھے ۔ سودا کے لکھنو چلے جانے کے بعد چونکہ انکی مشق ناتمام سی تھی کبھی کبھی خواجہ میر درد سے بھی اصلاح لیتے تھے ۔ چنانچہ انہیں کے ساتھ میں خواجہ میر درد کی بارہ دری میں جو اب بھی کوچہ چیلاں میں موجود ہے عرس کے موقع پر اکثر جاتی تھی ۔ خواجہ صاحب مجسم تصوف تھے انکا عارفانہ رنگ اردو شعر و سخن میں فانوس کے اندر شمع کی لو کی طرح اب بھی بڑی لطافت سے چمکتا ہوا نظر آتا ہے یہ ہر چند کے پیر زادے تھے مگر مجھے بزرگ زادی جانتے اور میری تعظیم کرتے تھے غرض ان آنکھوں سے جانیں کیا کیا دیکھا کہانتک بتاؤں ۔ مختصر یہ کہ اس دنیائے فانی

میں ہمیشہ کون رہنے آیا ہے میان قایم بہی قایم نہ رہے قایم کا ایک شعر میرے دل میں ابتک اپنی جگہ پر قایم ہے ؎

دل ڈہونڈہتا سینے میں مرے بوالعجبی ہے — اک ڈہیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

غرض جب میاں قایم اور درد دونوں راہی ملک بقا ہو چکے تو مجھے شاہ محمدی مایل نے پناہ دی یہ بہی اک نامی پرگو شاعر تھے غرض مایل کی طرف بہی دلی کے بہت لوگ مایل ہوے یہان تک کہ شاہ نصیر الدین نصیر بہی جنکے ہزاروں شاگرد دلی اور دکن میں ہوئے ان کے حلقہ تلامذہ میں بڑی عقیدت سے داخل ہو گئے۔ اور چند ہی دن کے بعد یہ استاد کے نام کو روشن کر کے فخر استاد تسلیم کئے جانے لگے۔ یہ سبب ہوا کہ مایل کے بعد مین نصیر کے یہاں چلی آئی۔ نصیر بڑا زبردست شاعر تہا مشکل زمینوں کو آسمان تک پہونچا دینا۔ اوس میں چار چاند لگانا اسکے بائیں ہاتھ کا کہیل تہا۔ لال قلعہ میں جب شہزادیوں نے انکی شہرت سنی تو دربار خاص میں جہانپر بادشاہ کا تخت تہا اک مشاعرہ ترتیب دیا گیا اوسمیں میاں ذوق بہی نو مشوقوں کے ساتھ اک کونے سے لگے بیٹھے تھے۔ میں شہزادیوں کے ساتھ محل میں تھی آگے پردے پڑے تھے یوں تو نصیر میرے گہر کا لڑکا ہی تہا اور میں اسکے مکان مین رہتی ہی تھی مگر یہ پہلا اتفاق تہا اوسکو مشاعرہ میں غزل پڑھتے سنا۔ بڑے کڑک دمک کی آواز تھی شعر پڑہنا اور وقتی تصویر کا نقشہ کہینچنا خاص اوسکا کام تہا۔ بادشاہ کے اصرار سے اوس نے کہڑے ہو کر اک قطعہ ایسا پڑہا اور کچھ ایسا بتایا کہ سبحان اللہ سبحان اللہ اک میری کیا سب کی نگاہ میں مجلس کے اندر یہ معلوم ہوتا تہا کہ کوئی پا لوہرن چوکڑی بہول کے کہڑا ہوا اہل بزم کا منہ دیکھ رہا ہے اور میاں نصیر اوسکو بتا کے یہ کہہ رہے ہین۔ قطعہ

یہ مجنوں سے نہین آہوے لیلے — بہٹک کر وہ ستین نکلا ہے گہر سے
جسے تو سینگ سمجھے ہے وہ ہین خار — لگے ہیں پاؤن مین نکلے ہین سر سے

سچ ہے کہ شعر گوئی اور شے ہے اور شعر خوانی اور چیز ہے یعنی اسکا بہی اک خاص مادہ ہوتا ہے

مختصر یہ کہ نصیر کا یہ دعوائے غلط نہ تہا کہ اُردو شاعری میرے گہر پیدا ہوئی اور انکی دو پشتوں کے بعد اصغر علی نسیم نے بہی اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

نسیم دہلوی ہم موجد باب فصاحت ہیں
کوئی اُردو کو کیا سمجہیگا جیسا ہم سمجہتے ہیں

بہرحال شاہ نصیر نے جب دیوان چندولال کے عہد میں آخری سفر حیدرآباد دکن کا کیا اور دلّی سے برخواستہ خاطر ہوئے تو مجکو حکیم مومن خان مومن کے حوالہ کیا۔ مومن نے ہرچند کہ شاہ نصیر سے برائے نام اصلاح لی تہی مگر وہ باوجود مجتہد فن، عالم، فاضل حکیم، اور شاعر ہونے کے میاں ابراہیم ذوق کیطرح اپنے استاد کے دست و گریبان کبھی نہ ہوئے وہ مرتے دم تک نصیر کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنا سعادت دارین جانتے تھے۔ اور یہ اوسی کی برکت تہی کہ غالب سے زبردست شاعر نے جسنے بہولی آنکہوں بہی ذوق کو نہیں دیکہا مومن کا لوہا مانا۔ اوسی زمانہ میں جب کوچہ چیلاں والی حویلی میں مومن خاں کے ساتھ میں رہتی تہی اک روز میاں ذوق اس سبب سے کہ دنیا ان جانتی تہی کہ یہ بہی شاگرد نصیر کے ہیں آئے اور دعوت دیکر مجہے اپنے یہاں لے گئے اوہی اونکے مکان کی وہ گز بہر کی لنگوٹی انگنائی میں فضا تو دور صاف ہوا تک نہیں پہونچی تہی غرض بندی نے ذوق کے کہنے سننے سے دو پان تو کہائے مگر اُلٹے پاؤں پلٹ آئی۔ مومن کی شان کو کیا کہیئے وہاں کون نہیں آتا تہا شہزادہ اور اُمرا کو چہوڑ دو شعرا میں مرزا نوشہ غالب۔ صہبائی۔ آزردہ۔ شکیبا۔ مجروح کی تو روز کی بیٹہک تہی جنکے روزمرہ اور زبان کی اصلاح میں کیا کرتی تہی غرض میر اور سودا کے بعد دلی میں اگر کوئی بزم تہی تو مومن و غالب کی تہی جسکو آسمان کج رفتار نے درہم برہم کر کے مٹا دیا غالب و مومن میں یارانہ تہا مومن خاں کے ابہی مرنے کے دن نہ تھے مگر اتفاق دیکہو کہ کوٹہے سے گر کے گہائل ہوئے اور مر گئے۔ انکا کلیات مرض الموت میں عبدالرحمن آہی خلف میر حسن تسکین شاگرد مومن نے مرنے سے تین دن پہلے مرتب کیا تھا۔

مومن ہر وقت عالم کرب میں رہتے تھے جب کہیں دس دفعہ آہی کچھ پوچھتا تھا تو ایک آدہ مرتبہ وہ ہوں ہاں کر دیتے تھے۔

"صاحب" کہیں عالم سکرات میں آدمی کو دماغ شعر ہوتا ہے۔ غرض اس کلیات کی نظر ثانی تو نہ ہو سکی ہاں ترتیب اور طباعت البتہ بے اعتبار صورت پر ہوگئی اگر اوسپر کوئی اعتراض کرے تو یہ اسکی نافہمی ہے۔ ہمیں یہ جملہ مومن کا یاد ہے جب انہوں نے کلیات اپنے سرہانے سے اٹھا کے ہاتھ میں لیا تو عبدالرحمن کو یہ کہہ کے دیا کہ ع حوالت باخدا کردیم و رفتیم۔ تو وہ دہاڑیں مار کے رونے لگا۔ اس واقعہ سے پہلے جب مومن خان سہسوان گئے تھے تو اُسوقت ایک نسخہ دیوان کا صاف کیا ہوا انکے پاس تھا اگر آج وہ یا اسکا ضایع شدہ کلام دستیاب ہو جائے مومن کی عظمت دہ چند بڑھ جائے۔ مومن اسکا ذکر بہت اکثر کیا کرتے تھے۔

مومن بستر مرگ پر جب ہوش میں ہوتے تھے تو کبھی کبھی عجب دل گداز ترنم سے کچھ نہ کچھ اشعار پڑھا کرتے تھے۔ یہ اس آخری رات کا ذکر ہے (یعنی جسکی صبح کو وہ کوچ کرینگے) کہ وہ عالم یاس میں رو رو کر اپنے ان شعروں کو پڑھ رہے تھے۔

گئے وہ خواب سے اُٹھ غیر کے گھر آخر شب ۔۔۔ اپنے نالے نے دکھایا یہ اثر آخر شب
مُو سفیدی کے قریب اور ہے غفلت مومن ۔۔۔ نیند آتی ہے یہ آرام دگر آخر شب

غرض یہ شاعر برگزیدہ روزگار ابھی نور کا تڑکا تھا کہ دنیا سے ہاتھ ملتا ہوا چل بسا۔ اک صاحب عشق کی شان بھی یہی ہے کہ شب بھر شمع سوزاں کی طرح رو رو کر بسر کرے اور صبح ہوتے عدم کا سفر کرے اس نامُراد کے مرتے کے وقت اسکی آنکھیں میرے چہرے پہ تھیں اور اس کے سرہانے نواب مصطفٰے خان شیفتہ و نواب اصغر علی خان نسیم یہ دونوں تلامذہ ارشد بیٹھے رو رہے تھے۔ اور سر پیٹ رہے تھے۔ دم آخر مومن کو اجل نے فرصت نہ دی کہ میرے متعلق کسی سے کچھ کہتے۔ آہ انکی جوانمرگی نے ساری دلی کو ہلا دیا تھا۔ چونکہ مومن کا لڑکا احمد نصیر خاں ابھی محض صغیر سن تھا اسلیے مومن کے پھولوں کے لیے ہیں وہاں سے

اُٹھ کے شیفتہ کے یہاں چلی آئی۔ ابھی اسکو چند ہی سال ہوئے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے آثار ظاہر ہونے لگے نواب صاحب پر اپنی ریاست کی آپڑی وہ افکار میں اُلجھ گئے۔ جب نواب اصغر علیخان نسیم نے اندرونِ شہر خاکی پلٹن اور گوروں کی آمد دیکھی تو ننگے سر ننگے پاؤں میرے پاس آئے اور قدموں میں گر پڑے میں نے منہ پر پانی چھڑکا تو انہیں ہوش آیا کہنے لگے اب تخت کے ساتھ دلّی کی بھی خیر نہیں یہاں رہ کر کیا کروگی۔ میں لکھنو جاتا ہوں تم بھی میرے ساتھ چلو وہاں ابھی فنِ شعر کا چرچا ہے۔ اُمرا تمہیں سر آنکھوں پر بٹھلائیں گے۔ غرض میں مصیبت کی ماری لکھنو کے سفر کو تیار ہوگئی فوراً ہی ڈولی میں بیٹھی پہلے قطب صاحب کی درگاہ میں پھر سلطان جی میں گئی اور اجازت طلب کی۔ حکم ہوا کہ جاؤ خدا حافظ چنانچہ میں آیا جانکی روحِ پاک کو فاتحہ کا ثواب پہونچا کر زار زار روتی ہوئی ڈولی سے اتر کے نسیم کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی اور دلّی سے نکل پڑی۔ وہ بھی رونا عجیب رونا تھا کہ لکھنو تک ہچکی لگی رہی۔ یہاں میرے آنسو پونچھنے والے میر حسن اور میر خلیق کے بچے تھے جنکی مہمانی میں اوّل اوّل بسر ہوئی۔ پھر نواب محمد تقی خاں سالار جنگ کے سات سو ستاون روپیہ کے وثیقہ دار نسیم کے شاگرد ہوتے اور غیب سے یہ صورت نکلی کہ میں نسیم کے ساتھ نہایت عافیت سے رہنے لگی اسی زمانہ میں ناسخ و آتش کا دیوان میں نے بنظر اصلاح دیکھا تھا۔ اور بحر، سحر، رشک، برق، وزیر، صبا وغیرہ بھی مجھ سے فیضیاب ہوئے تھے یہ سب تھا مگر گردشِ تقدیر بھی دلّی سے جو قدموں لگی ہوئی آئی تھی وہ ساتھ تھی یعنی ایک روز نسیم نے مجھ سے کہا کہ رات میں نے خواب میں اک شعر کہا ہے دیکھئے کیا انجام ہو یعنی ؎

سفر ہے دشوار خواب کب تک بہت بڑی منزل عدم ہے
نسیم جاگو کمر کو باندھو اُٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

اس شعر کا سننا تھا کہ میرا ماتھا ٹھنکا اس واقعہ کو چند ہی دن ہوئے تھے کہ گلشنِ ہستی سے نسیم نے کوچ کیا اور مرتے وقت مجھے اپنا نشان اور مقام یوں بتایا کہ ؎

دور ہم بخل گر ہیں گے صفت گرد نسیم   ہم پس مرگ بھی قربان گلستاں ہونگے

انا للہ وانا الیہ راجعون یہ بھی ہو چکا۔ اب بھنور غم میں بجز خدا میرا ناخدا کون تھا اسی ٹوٹی ہوئی کشتی کو گرداب بلا سے نکالا یعنی نسیم کے دو سر برآوردہ شاگرد لکھنؤ میں تھے جنہیں سے ان دنوں منشی اشرف علی اشرف مطبع نولکشور کی سرکار سے اور شیخ امیر اللہ تسلیم نواب محمد تقی خاں افسر کے دربار سے وظیفہ پاتے تھے۔ ان دنوں میں تسلیم اپنے استاد کے بہت گرویدہ تھے چنانچہ اُن کا ایک شعر ہے

مرا جو نالہ موزوں ہے تسلیم   تصدق ہے نسیم دہلوی کا

نسیم کے مرنے کے بعد تسلیم کی طرف نواب صاحب رجوع ہوئے اور باقاعدہ شاگرد بھی ہو گئے جسکے باعث تسلیم کی اچھی طرح بسر ہونے لگی اب انہوں نے مجھے بھی سمیٹا یعنی میں انکے ساتھ ہو گئی بس یہی وہ نکتہ تھا کہ میں نے دلی کے پلٹ جانے سے لکھنؤ کے قیام کو زیادہ پسند کیا۔ مختصر یہ کہ محمود نگر میں جہاں تسلیم کا جدی مکان تھا اور جس محلہ میں آتش بھی تھے میں رہنے لگی جب محمد تقی خاں بھی مر گئے تو خدا نے رزق کا دوسرا دروازہ کھول دیا یعنی نواب کلب علی خاں نے تسلیم کو رامپور طلب کر لیا مجھے بھی حسب طریقہ اسلاف تسلیم نے اپنے ساتھ لیا اور میں رامپور چلی گئی مگر گاہے گاہے انکے ساتھ لکھنؤ آجاتی تھی یہ اسلئے کہ تسلیم کا لڑکا تجمل حسین کہ حافظ قرآن بھی تھا اور خوشنویس بھی لکھنؤ میں رہتا تھا۔ تسلیم یوں تو لکھنؤ کے تھے اور لکھنؤ کا رنگ انکے کلام میں بہت ہے مگر کبھی کبھی دلی والوں کے انداز میں بھی لکھتے تھے۔ چنانچہ انکے دو اک شعر یاد بھی ہیں۔

مجھپہ احساں ہے مزار پاک کا   خاک نے پردہ کیا ہے خاک کا
سوختہ جاں کون سا مدفون ہے   کچھ دھواں دیتا ہے پہلو خاک کا

تسلیم سنہ ۱۱۹ھ میں رامپور سے آنکھیں بنوانے لکھنؤ آئے میں انکے ساتھ آئی اب کے یہ کچھ ایسا آئے کہ بس یہیں کے ہو رہے۔ اس روشن طبع کے مرنے کی تاریخ

چراغ بہشت ہے خدا انکی قبر کو رہتی دنیا تک روشن رکھے ایک سو تین سال کی عمر پائی اسی علالت کے زمانہ میں تسلیم کے دیکھنے کو سید ضمیر الدین احمد عرش بھی آئے تھے یہ وہی عرش ہیں جنہوں نے یہ تاریخ لکھی ہے اور تسلیم کے مرنے سے بہت پہلے حیاتِ تسلیم بھی لکھی تھی۔ یہ کتاب میاں حسرت موہانی شاگرد تسلیم نے چھپوائی ہے۔

غرض تسلیم کے بعد عرش نے مجھسے دست بستہ کہا کہ ہرچند میں پورب کا رہنے والا ہوں اور پورب کی آب و ہوا حضور کی صحت کے حق میں مضر تو ضرور ہوگی مگر میرا کلیات محتاج اصلاح ہے آپ میرے ساتھ کیا تشریف لے چلیں میں خدمتِ لائقہ میں کمی نہ کرونگا چنانچہ عرش کے بہت کہنے سننے سے میں اس کوردہ مقام میں جو عظیم آباد پٹنہ کے پاس ہے چلی آئی ہوں اور انکی زندگی تک انشاء اللہ رہونگی۔ تقریباً تین سو برس کی عمر میری ہونے آئی مگر بزرگوں کی دعا سے عالمِ تجرد میں گزار دی اور اولادِ معنوی پر اکتفا ہے بہت گذر چکی اب ولایت کی ہوا کے جھونکے ہندوستان میں بہت آنے لگے میرا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی ٹھنڈا ہوا چاہتا ہے ؎

چراغِ شب ہجر ہیں جل بجھینگے   گجر بجتے بجتے سحر ہوتے ہوتے

اچھا اب رات بہت گزری لو سو رہو۔ کہیں گھبرا کے ایسا نہ کہا ٹھو کہ ؎

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر   اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے سے

اب میں بھی نماز تہجد کی تیاری کرتی ہوں۔ شب بخیر صبح سے مومن خاں کے حالات عرش کو لکھواؤنگی۔ انشاء اللہ۔

رباعی

میزانِ سخن سنج میں تلتا ہوں میں   فکرِ گُہرِ نظم میں گھلتا ہوں میں
دل رہتا ہے بند قفلِ ابجد کی طرح   جب حرف شناس ہو تو کھلتا ہوں میں

ابھی صبح ہونے میں دیر ہے جب تک آپ حضرات تمہید ملاحظہ فرمائیں پھر حالات مومن سنیئگا

تمہید

دل اب تو عشق کے دریا میں ڈالا
توکلت علے اللہ تعالے

قبل اسکے کہ مومن کی سوانح عمری شروع ہو۔ چند ضروری باتیں اسکے ضمن میں عرض ہیں جو معلومات کی بڑھانے والی ہیں۔

ذوقِ سخن مجکو ارباب بنارس و مرزاپور کی صحبت میں ہوا امیر و داغ و جلال و تسلیم اور شمشاد ہندوستان میں عروج پر تھے۔ میں نے ابتدائی چند غزلیں بغرض اصلاح علامہ مولانا مولوی عبدالاحد شمشاد فرنگی محلی لکھنوی یادگار شیخ ناسخ کی خدمت میں پیش کی۔ یہ وہ وقت ہے جب میں بلند پروازی اور نازک خیالی کا دیوانہ تھا میرے مطبوعہ کلیات میں اُن غزلوں کو دیکھو جنکے حاشیہ پر (ق) ہے۔ مولانا شمشاد علمائے فرنگی محل سے تھے نیز وہ اُستاد کیا استاد گر تھے اور متروکات رشک مرحوم کے پابند تھے یہی سبب تھا کہ کلام انکا آب داری میں کم مگر عیب سے پاک تھا شیخ امیر اللہ تسلیم جنکی مشق کو مستند اساتذہ میں کوئی نہیں پہونچا نہ یہ عمر کسی نے پائی فرماتے ہیں کہ ؎

زہے اوجِ کمالِ فکرِ شمشاد | کہ از ادراکِ حدّش عقل حیران

وغیرہ وغیرہ ؎

بگوشِ من ز ہاتف آمد آواز | بگو دیوان استادِ سخندان

مولانا شمشاد کی شاعری قلق اور خواجہ وزیر کے زینہ سے اٹھ بام فلک نما تک پہونچی ہے جہاں ناسخ کا مقام ہے۔ انکا کلام ناسخ و سودا کی بلند طبیعتوں سے ٹکر کھاتا ہوا اک مطلع سن لیجئے ؎

ظاہر کرے جو وسعتِ قدرت خدائے چرخ | ذرّے کے اک گوشہ کے اندر سمائے چرخ

مجکو جو کچھ انکی صحبتوں سے فیض حاصل ہوا وہ ناسخ کا صدقہ تھا اسی سبب سے ابتدا میں ہم خود رشک کو ملا آبادی اور رشک لکھنوی کے پیرو ہو رہے اوسی عہد میں صد ہا غزلیں ہمنے لکھیں بہت سی پھینک دیں کچھ دیوان میں ہیں یہ اسلئے کہ فصل نکل گئی تھی اک مطلع اوسی انداز کا یاد آگیا ہے نذرِ ناظرین کرتا ہون ؎

ہجر کی شب تھا وہ طوفان دیدۂ پُر آب کا جسمیں خطِ استوا تنکا بنا سیلاب کا

میں کیا خود علامہ شمشاد اخیر میں اس کو محسوس فرمانے لگے تھے کہ اس رنگ کو بدلنا چاہیئے چنانچہ وہ تصوف کی طرف آگئے تھے یہاں تک کہ قلق کے بعد اپنا کلام مولانا عبد العلیم آسی سکندر پوری کو بھی دکھلایا تھا جو اپنے زمانہ کے ایک فقیر منش شاعر اور خواجہ میر درد ثانی تھے۔ آسی کا بھی اک شعر بطور نمونہ سن لو ؎

بے حجابی یہ کہ ہر ذرہ سے جلوہ آشکار اوس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آجتک نا دیدہ ہے

خیر جب یہ قصے ختم ہو چکے اور اس بزم میں شمع بے نور سی نظر آنے لگی اور دماغ بھی کچھ ہوش سنبھالا۔ تو خیال آیا کہ بہار کے دن نکل گئے آج ناسخ و سودا کے نام ایک سورہ فاتحہ پڑھ کے بخشنے والا کون ہے جو میرے اجڑے مزار پر دو پھول چڑھا جائیگا۔ غرض طبیعت نے غالب و مومن کی طرف جھکایا مگر یہ شرط لگادی کہ ان کے دشوار پسند انداز سے الگ رہ کر تقلید کرو اور تصوف کی چاشنی خواجہ میر درد کے دسترخوان سے لو چنانچہ یہ ٹوہ لگائی کہ کس کی طرف اپنے کلام کو رجوع کروں اور اب اگر دلّی جاؤں تو کسکے در پر۔ ہر چند کہ میر مہدی مجروح شاگرد غالب زندہ تھے مگر ضعفِ بصارت اور پیری کے سبب گوشہ گمنامی میں بیٹھ چکے تھے اسلیے انکا پتہ بھی نہ چلا اور قسمت کے پھیر نے وہاں تک پہونچنے بھی نہ دیا۔ قدسی و کلیم شیخ امیر اللہ تسلیم شاگرد نسیم کے طرف جھکا۔ اگرچہ وہ تھے تو لکھنؤ کے مگر مرتے دم تک دلّی والوں کا دم بھرتے تھے اور اور دلّی کی راہ سے بھی آشنا تھے اسلیے میں نے یہ سمجھ لیا کہ بس اسی درگاہ سے میری مراد

پوری ہوگی یہیں بیٹھ جاؤ اور چلہ کشی کرو۔ یہاں تک کہ تسلیم کے فیضان نے مجکو اُس منزل تک پہونچا دیا جسکی تلاش تھی اور جسکی جھلک میری ان غزلوں میں ہے جنکے حاشیہ پر (م اور ح) پاتے ہو۔ اور ضمیمہ تیر و نشتر اوستاد مرحوم کے وصال کے بعد کے روحانی فیضان ہیں اسمیں زیادہ تر میر تقی میر کا انداز ہے جیسے [۱۲] غرض جب میں نے اس سلسلہ پاک میں ارشاد حاصل کیا تو مومن خاں کے کلام کو محتاج تنقید پایا اور جب اس مسئلہ پر غور کیا تو انکشاف ہوا کہ ہر چند۔ عالم۔ فاضل۔ گریجویٹ۔ تو گلی گلی مارے پھرتے ہیں مگر اُن میں ایسے نقاد فن معدوم جو مومن کے نام کو زندہ کر سکیں اور اگر ایسے ماہران فن کی ڈھونڈھ کی تسلیم بھی کی جائے تو ۔

امیر اسوقت کے تسلیم سب نافہم و جاہل ہیں　　　ہنر کی قدر جب کرتے کہ خود بھی باہنر ہوتے

ان غریبوں کی محنت کی داد کون دیگا اون کی کتابیں کون چھپوائیگا۔ خیر تو بطور خود مومن کے متعلق مجھے تین ضروری تلاش پیدا ہوئی ۔

۱۔ اُن کی تصویر کسطرح عالم وجود میں لاؤں۔ یہ اس عہد کی بات ہے جب میں نے استاد تسلیم کو مُراد آباد لے جا کے تصویر کھنچوانے پر مجبور کیا ہے یعنی یہ وہ تصویر جو حیات تسلیم مطبوعہ لاہور میں پاتے ہو۔ پھر اُنکی دوسری تصویر درباری انداز میں کھنچوائی سجواول اول رسالہ ادیب الہ آباد میں میرے مضمون کے ساتھ چھپی اور وہی اُنکے تیسرے دیوان دفتر خیال مطبوعہ رام پور اور حیات تسلیم کامل مطبوعہ علیگڈھ میں ہے غرض اس تلاش کو تقریباً تیس سال ہوے ہونگے ۔

۲۔ مومن کے مزار کا پتہ کس طرح چلے ۔

۳۔ موجودہ تاریخوں کے علاوہ مومن کے معدوم حالات کسطرح بہم کیئے جائیں۔

---

[۱۲] عرس بھو کیا راتنے گئے ہیں پھندے سے دشمنو کیسے　　　اُسکی گلی میں سب تجھے دیکھا نہیں کسی نے
اک شمع کا تمہارے رونا سچین تھے تنگے　　　رونا تھا اک ہمارا پوچھا نہیں کسی نے

چنانچہ پہلے میں باوجود عدیم الفرصتی ان اغراض کے ساتھ استاد تسلیم کے پاس لکھنو گیا
اسوقت وہ پیر ناتوان ہو چکے تھے۔ سماعت اور بصارت رخصت طلب تھی اک آہ سرد
کھینچ کر فرمانے لگے کہ میاں وہ باتیں جو بزرگانِ قدیم یا نسیم سے سُنی تھیں سب فراموش
ہو گئیں اب حواس کہاں ہیں اگر سینے میں کوئی خیال موجزن ہے تو وہ صرف مرنے کا ہے
اور بس یعنی ؎

دمِ واپسین بر سرِ راہ ہے　　عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

"ناظرین" آپ صاحبوں کو علم ہو کہ تسلیم نے رام پور میں غالب کو بخوبی دیکھا تھا
ناسخ و آتش کے مشاعروں میں عرصہ تک شریک ہوئے تھے۔ بحر۔ سحر۔ رشک منیر
سے یارانہ تھا۔ مومن کا عہد بخوبی پایا مگر ان کو دیکھا نہیں تھا۔ غرض جب ایسے در سے
یہ جواب محرومی مل گیا تو میری نظیر سکندر کی نظیر تھی جسکو خضر آبِ حیوان تک لے گئے
مگر وہ تشنہ کام و محروم واپس ہوا۔ غرض دل کے ساتھ ساتھ سر پکڑ کے میں بھی بیٹھ
گیا اور کسیطرح صحر لئے پُر حسرت کی بھیانک رات کاٹی جب سویرا ہوا تو ہمت سے کام
لیکر کانٹوں سے بچ بچ کے قدم بڑھا یا خضر بھی سامنے سے آنکلے انہوں نے فرمایا کہ ادھر کہاں
رام پور کی طرف رُخ کر اب تین سال کے بعد یہ منزل مر مر کر تمام کی یعنی علیگڈھ ہوتا ہوا
رام پور کو گیا رستہ میں حسرت موہانی مل گئے انہوں نے کہا کہ مومن کی تصویر کتب خانہ
رام پور میں ہے یہ وہ زمانہ ہے جب استاد مرحوم نے لکھنو میں رحلت کی تھی اور رام پور
میں ہر طرف اُنکی موت کا چرچا تھا۔ یہاں میں بلبل تسلیم اور دیگر اراکین ریاست
کا مہمان رہا اور اک خاص ذریعہ سے کتب خانہ میں بھی گیا مگر بد نصیبی کہ اسی زمانہ
میں سنجر طہرانی کا جو ملک الشعرا مرحوم سپہر کے شاگرد اور مہتمم کتب خانہ تھے انتقال
ہوا تھا۔ اسلئے کتب خانہ بند پڑا تھا۔ البتہ بعض کہن سال حضرات سے سنا کہ مومن غدر سے
بہت پہلے عہد نواب محمد سعید خان میں اور بعض نے کہا کہ عہد نواب یوسف علیخان میں

میں نواب صدیق حسن خان بھوپال کے ہمراہ رام پور میں تشریف لائے تھے اور اسی زمانہ میں اور انکی تصویر کھینچی ہی تھی اور وہ تصویر ضرور ہے اسکے علاوہ میرے اک دیرینہ کرم فرما مولانا شاہ مبارک حسین مرحوم متوطن بھوہ ضلع شاہ آباد کہ فقیر، حکیم، اور منجم بھی تھے اور عرصہ تک رام پور میں مقیم رہے تھے۔ مجھسے آنکھوں کی دیکھی کہتے تھے کہ کتبخانہ میں مومن کی وہ تصویر میں نے خود دیکھی تھی اور اُس پر مومن کے قلم سے لکھے ہوئے کچھ شعر بھی دیکھے تھے چنانچہ شاہ صاحب نے بھی اپنی حیات[سٹلہ] میں بڑی کوشش کی مگر اخیر میں یہ سنا گیا کہ پرانے جو کھٹے سب ہٹا دئے گئے ہیں غرض انکے علاوہ ایک کیا صدہا کوششیں اس تصویر کے لیئے کیں اخبارات اور رسالوں میں تحریک کی مگر وہ نہ ملی نہ ملی۔ اب دیکھیئے کہ میری پریشانیوں پر انکی رحمت کو ترس آیا غیب سے مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی۔ (بی۔ اے رجسٹرار ہائی کورٹ حیدر آباد دکن پیدا ہوئے) اور وہ ایک تصویر مومن کی مصور گرامی و ادیب نامی خواجہ امان دہلوی مترجم بوستان خیال کی کھینچی ہوئی جو خود مومن کے رشتہ دار تھے ملک کے سامنے لائے اور تقریباً ایکصدی کے بعد بذریعہ رسالہ اردو حیدر آباد دکن اور پھر بذریعہ رسالہ نگار لکھنؤ ۱۹۲۸ء میں دنیائے ادب کی مشتاق آنکھوں کو مومن کا روشناس کیا۔ مومن کی روح نے تصدیق کرتے ہوئے خود یہ شعر پڑھا کہ ؎

مدت سے نام سنتے تھے مومن کا بارے آج
دیکھا بھی ہم نے اُس شعرا کے امام کو

مرزا صاحب دلی کے بہترین فاضل اور ادیب ہیں انکے علاوہ یہ خود استاد فن مصوّری بھی ہیں انکا سلسلہ خواجہ امان اور دلی کے مشہور و قدیم نقاش یعنی خاندان محمد فضلی مرحوم سے وابستہ ہے جو عہد شاہی میں ممتاز تھا۔ غرض ہر نوع مرزا صاحب

سٹلہ خدا بخشے شاہ صاحب بڑے نقاد فن بزرگ تھے اور استاد تسلیم اور مصنف غیاث اللغات کی صحبت بھی اوٹھائی تھی افسوس ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے کہ چل بسے مرنے سے کچھ دن پہلے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ لو آج میں بھی میدان میں آتا ہوں ہمارے عزیز مولوی محمد خلیل صاحب ایم اے کیسے اچھے بہترین مرثیہ نویس ہیں خدا انکو سلامت رکھے

شکریہ دوام کے مستحق ہیں اور یہ تصویر جسکا عکس اس کتاب پر ہے اور اک نئے بلوک سے تیار کی گئی ہے یہ بھی اُنہی کی عنایات کا صفحۂ ہستی پر دم بھر رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ اگر مرزا فرحت اللہ بیگ نہ ہوتے تو میں بھی مومن کی طرح فنا ہو جاتی۔ مومن کیا غالب کی تصویر کو بھی عالم وجود میں لانے والے آپ ہی ہیں۔

خیر جوئندہ یابندہ یعنی تحریک پیہم نے سوتوں کو آخر بیدار کر ہی دیا اور مومن کی تصویر نے بزبانِ بے زبانی یہ کہہ بھی دیا کہ صاحبوں میں اک صاحبِ علم ہی نہیں بلکہ صاحب جمال و وضعدار بھی ہوں۔

سے اب تلاش مزار مومن کو نکلتا ہوں۔ تقریباً پچیس ۲۵ سال کا زمانہ گزرا کہ میں دلّی گیا وہاں چپے چپے زمین کی خاک چھانی مگر کچھ پتہ مزارِ مومن کا نہ چلا کوئی رہنما ہو، کوئی آشنائے منزل ہو تو بتلائے غرض ٹھوکریں کھاتا پھرا یہاں تک کہ ایکروز سلطان جی میں پہونچکر اتفاق سے غالب کے مزار پر پہونچ گیا جس پر آج بھی میر مہدی مجروح کی تاریخ موجود ہے میں سمجھا کہ شاید مومن بھی اپنے ہمنوا یار کے قریب لیٹے ہوئے ہوں مگر لوگوں نے کہا کہ تم عجب سودائی ہو، مومن غدر سے بہت پہلے مرے اونکا مزار جس پر نہ کوئی کتبہ نہ اینٹ تمہیں کون بتائے کہ کہاں ہے اُس عہد کے لوگ مر مٹ گئے اوس زمانے کی دلّی پامال ہو گئی تم ہو کہاں۔ اس کہنے پر بھی مجھے چین نہ آیا خواجہ میر دردؔ کے خاندانی مزارات سے قطب صاحب تک کے گورستان اور کتبوں کو ایک ایک کرکے دیکھا مگر مومن کے مزار کا پتہ نہ چلا۔ غرض نہ پوچھو تلووں میں چھالے پڑ گئے اور وہ چھالے میری غربت اور ناکامی پر پھوٹ پھوٹ کے روئے۔ پھر بھی یہ عقدہ حل نہ ہو سکا یہاں تک کے تنگ آکر وطن کو پلٹ آیا۔ مگر دوستوں دل کی لگی کہاں بجھتی ہے۔ دو سال کے بعد پھر دلّی گیا اور مصنف رسالہ آبحیات کے نشان دہندگی (مہندیوں) میں تلاش کا ارادہ کرکے فراش خانہ کی کھڑکی سے نکلا پہلے فتحپوری

پھر مسجد جامع میں آیا وہاں سے سامنے کی اک گلی پکڑی چلا جاتا ہوں اور ادھر ادھر دیکھتا
جاتا ہوں کہ شاید کوئی پیر صد سالہ مل جائے خبر نہیں کن کن محلوں سے گذرا البتہ اک جگہ بچہ
مٹیا محل لکھا ہوا دیکھا وہاں اک شریف صورت بوڑھا آدمی بھی نظر آیا اس سے پوچھا کہ
مومن خاں کا نام آپ نے سنا ہے وہ کہنے لگا میاں میں شاعر وائر نہیں ہوں اسی محلہ میں اک
صاحب سید وحید الدین بیخود رہتے ہیں ان سے پوچھو۔ غرض آگے بڑھ کے اک چھوٹا سا
دروازہ نظر آیا جس میں ٹاٹ کا پردہ لٹکا ہوا تھا وہاں پوچھ کر بیخود صاحب بیخود صاحب آواز دی
کچھ دیر کے بعد ایک پچاس برس کے آدمی کھچڑی دار داڑھی اٹھے ہاتھ میں حقہ لیے
برآمد ہوئے کہا کہ فرمائیے میں ہی بیخود ہوں۔ میں نے عرض کیا حضرت مجھے کچھ اطمینان سے
گفتگو کرنی ہے غرض وہ اپنے کوٹھے پر مجھے لے گئے خاطر سے پیش آئے سب حال سن کر کہا
کہ صاحب میں نے مومن کو نہیں دیکھا ہاں انکے بیٹے احمد نصیر خاں کو ضرور دیکھا تھا
اور وہ اس کوٹھے پر بھی اکثر تشریف لاتے تھے۔ اب رہا مزارِ مومن تو وہ مہندیوں میں ہے
وہاں میرے بھی اکثر عزیز سوتے ہیں چلئے میں لے چلوں۔ غرض وہاں سے چلا اور مہندیوں
میں آیا غرض بیخود صاحب ادھر ادھر دیکھتے بھالتے مجھے ایک ایسے مزار پر لے گئے جس کا
حلقہ اینٹ کا تھا اور اس پر کچھ پھول بھی پڑے ہوئے تھے۔ میں نے فاتحہ پڑھنے کو پڑھی
مگر دل میں یہ کھٹکا تھا کہ آج مومن کا کون سا عزیز زندہ ہے جس نے انکے مزار پر پھول
لاکے ڈالے ہیں پھر جب محافظِ گورستان سے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ مزار کسی اور
کا ہے اور مومن کا مزار معدوم ہے حالانکہ اسی کے قریب اک قبر میں مومن خاں
صاحب پڑے ہوئے ہیں مگر اتنا نہیں کہتے کہ؎

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب — تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

۱۲؎ سید صاحب کا بڑا احسان کہ آپ نے تقریباً اس ملاقات کے بیس برس بعد مومن کے حقیقی نواسہ جناب
سید ناصر جلیل ناصر تخلص۔ وکیل کا پتہ دیا جنکی امداد سے یہ کتاب مالامال ہے۔

غرض عقدہ ایکبھی حل نہ ہوسکا اور میں اندرون احاطہ داخل ہوا وہاں حضرت مولانا شاہ عبد العزیزؒ اور اُنکے خاندان والوں کے نام فاتحہ پڑھ کے اپنی قیام گاہ میں واپس چلا آیا۔ اسی سفر اور نشان مشکوک کا ذکر ہمنے عرصہ ہوا رسالہ مخزن لاہور میں بذریعہ اک نظم کے کیا ہے مختصر یہ کہ بہت پریشانی کے بعد وطن کو پلٹ آیا۔

اب چند سال کے بعد پھر دلّی گیا اور ایکبیہ فیصلہ کرکے چلا کہ کوچہ چیلاں میں چل کے رہونگا اور وہیں مومن کا حال معلوم کرونگا چنانچہ اس محلے کے قریب کے ہوٹل میں ٹھہرا اور صبح کو کوچہ چیلاں میں آیا وہاں ایک مختصر سی مسجد نظر آئی جسمیں کچھ طلبا بھی تھے اونکی زبانی یہ معلوم ہوا کہ خواجہ میر دردؔ کی بارہ دری یہی ہے میں نے وہاں پوچھا کہ بھئی کسی ثقہ آدمی کا پتہ بتاؤ تو ان لوگوں نے اک مکان کے طرف اشارہ کیا جسمیں ایک (سائن بورڈ) بھی لگا ہوا تھا۔ اور اس پر حکیم سید ناصر نذیر فراقؔ جانشین دردؔ لکھا ہوا تھا دیکھا کہ کچھ شیشیاں کچھ بوتلیں قرینے سے سجی ہوئی ہیں۔ زمین پر فرش سے گاؤ تکیہ سے لگے ہوئے اک لال داڑھی والے ضعیف العمر شخص سیاہ مخمل کی اچکن اور بغیر پھُندنے کی میلی سی ترکی ٹوپی پہنے ہوتے بیٹھے ہیں۔ صاف رنگ سرخی گالوں پر نمایاں قد متوسط جسم گداز کوئی ساٹھ برس کی عمر ہوگی غرض دریافت سے پتہ چلا کہ فراق صاحب آپ ہی ہیں جنکے ادبی مضامین سے ہندوستان کے مشہور رسالے بھرے پڑے ہیں۔ جب ان بزرگ نے خاکسار کا نام سُنا تو ملکی شہرت کے سبب پہچانا اور بغل گیر ہوسکے پان ٹھیرا یا اور اسی ملاقات میں اپنی اک مثنوی موسوم بہ بین بیتی بھی سُنائی اور اسپر مجھے تقریظ لکھنے کو کہا غرض آمدم برسر مطلب میری اُنکی باتیں شروع ہوئیں۔ جب میری سالہا سال کی پریشانیوں کو سُنا تو کہنے لگے آپ بیکار ہی اتنی مدت سے دلّی کی خاک چھانا کرتے ہیں اور نئی روشنی والوں کے پھیر میں پڑے ہوئے ہیں وہ مومن کو اور مومن کی عظمت کو کیا جانیں آپ مجھے ملے ہوتے میں ان بزرگوں کی کفش برداری کا شرف رکھتا ہوں مومن خاں ہمارے رشتہ دار تھے۔ میرے

گھرانے سے انکے تعلقات۔ خود میرے والد فارسی میں اُنکے شاگرد۔ وہ دیکھو سامنے والا
کوٹھا جو نظر آرہا ہے اُسی پر وہ رہتے تھے اور وہیں سے وہ گرے غرض اُنکے واقعات
سنکر آنکھوں میں آنسو بھر آئے دورانِ گفتگو میں پتہ چلاکہ یہ وہی فراق ہیں جنکا کچھہ حصہ
اُس گاؤں میں بھی ہے جو علاقہ شہرام ضلع آرہ میں خواجہ میر درد کو شاہانِ دھلی سے ملا تھا
اسی سلسلہ میں یہ کبھی کبھی گیا جی میں بھی آتے جاتے ہیں۔ بہر حال مجھے یہ ہمراہ لیکر مہندیوں
میں گئے اور ٹھیک اسی مقام پر لائے جسکا نشان آزاد مرحوم نے دیا ہے میں مومن
کی خاکی چھپر کھٹ سے لگ کے خوب رویا اور پھر فاتحہ سے فراغت پائی۔ لیجئے یہ
مُراد بھی پوری ہوگئی اب تک تو میں نے خود اپنے صرف سے اس مزار پر کتبہ لگوا دیا ہوتا
کیونکہ سارے مرحلے فراق صاحب کے ذریعہ سے طے ہو چکے تھے مگر کیا کہوں اک
حادثہ عظیم نے نیز عرش پریس کے مالی ضعف نے مجکو اس سعادت سے محروم
رکھا۔ اب یقین ہے کہ ہمارے محترم کرم فرما جناب ناصر جلیب صاحب وکیل
نواسہ مومن خواہ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی عزیزانِ مومن
عنقریب انجام فرمائینگے کیونکہ میں بار بار ان حضرات کو متوجہ کر رہا ہوں اور کتبہ
مزار کے لئے مومن کا یہ بہترین شعر بھی نوٹ کرا چکا ہوں ؎

جسے آپ کہتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جب کوئی نہ کریگا تو انشاءاللہ میں خود اٹھوں گا۔
اب سے ترتیب واقعاتِ مومن کی بحث شروع ہوتی ہے جسمیں مدد کرنے کا وعدہ
سالہاسال سے فراق صاحب نے بھی کر رکھا تھا۔
درحقیقت یہ کام تلامذہ مومن و معاصرین مومن کا تھا جو اک اک کر کے کاروان
دھلی سے آواز جرس کی طرح کچھہ رات رہے نکل گئے اور عدم آباد کو آباد کئے بیٹھے ہیں

اب غدر کے بعد کے لوگوں میں جو بعض کو اس پر توجہ ہوئی تو وہ توجہ اک سرسری لباس رکھتی ہے پھر ایک صدی کے بعد کا مورخ اگر جان بھی دے دے تو کیا یہ ممکن ہے کہ آج حالات مومن جمع کر لے مگر پھر بھی مر کھپ کر بہ زور زر دپریشانی میں نے جو اطراف ہند اور خاص دہلی کے بچے بچائے بوڑھوں سے حاصل کیا تھا اور جن کو بڑی حفاظت سے اک جزو دان میں رکھ کے بکس کے اندر آج کے لئے بند کر دیا تھا وہ میرے دوران علالت میں ذرا سی غفلت کہ سبب میری اور غیر مطبوعہ تصانیف کے ساتھ (جسمیں آثار قدیمہ دھلی کے متعلق بارگاہ سلطانی نام اک کتاب تھی اور جسکے کچھ اجزا چھپے چھپائے تصویروں کے ساتھ رسالہ ادیب الہ آباد اور رسالہ مخزن لاہور وغیرہ میں چھپ چکے تھے اور نہایت مقبول ہو کر چونکہ وہ چونکہ وہ اخبارات میں اسکی نقل کی گئی تھی وہ اور کچھ حصہ عرشی اللغات کا جسمیں تین ہزار سے زیادہ محاورات زبان اردو مع اسناد اور مختصر حالات اساتذہ مندرجہ لغت تھے وہ نیز ڈیڑھ جلدیں مطبوعہ کلیات عرشی کی تھیں یہ سب کتابیں) دیمک کی بدولت بری طرح برباد ہو گئیں اور برگ گل کی طرح انکو باد مخالف نے ایسا منتشر کر دیا کہ حشر تک بھی ڈھونڈھنے سے نہیں مل سکتیں نہ وہ دل و دماغ باقی ہے کہ دوبارہ ان چیزوں کو حوالہ قلم کروں انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میرے اس درد کو وہی مصنفین محسوس کر سکتے ہیں جنکو خدانخواستہ ایسی روحانی تکلیف پہونچی ہو۔ ورنہ سخن فروشی سمجھئے۔ خدا کا شکر کہ میری ان کتابوں کا ذکر اکثر اخبارات وغیرہ میں ہوتا رہا ہے اور یہی میری راست گوئی کی دلیل ہے۔ بہرحال اب آسمان کج رفتار سے اسکے نعم البدل کا طلب کرنا عمر رفتہ کو بلانا ہے یہ اسلئے کہ وہ تاریخی بوڑھے قبروں میں جا کے لیٹ رہے ہیں اور اب تو وہیں سے یہ فرما رہے ہیں کہ

؎ کیا کیا نہ بعد مرگ کے آسائشیں ملیں — میں قبر میں مسافر منزل رسیدہ ہوں

بہر حال جو ہونا تھا ہو گیا اب باسی کڑہی میں پھر اُبال آیا ہے تو مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ غدر سے پہلے مومن کی حیات میں جب اُنکی بزم اہل کمال سے بھری پڑی تھی اول اول نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کو خیال تذکرۂ شعرا لکھنے کا ہوا چنانچہ انہوں نے اُس زمانہ کے مذاق کے بموجب گلشنِ بیخار[1] نام اک تذکرہ لکھا اُسمیں مومن کا حال بھی رقم کیا مگر افسوس کہ یہ تذکرہ بہ زبانِ فارسی ہے جسکے پڑھانے اور سمجھانے کو غالب مرحوم کا زندہ کرنا لازمی ہے۔ یعنی ایسے دورِ بدترین میں کہ علمِ فارسی ہندوستان کے پردے سے معدوم ہو گیا اور تقریر کیا تحریرِ فارسی مذموم سمجھی جانے لگی اس کتاب کا عدم وجود برابر نہیں تو کیا ہے۔ کیا شیفتہ دنیا کا رنگ نہیں دیکھ رہے تھے کیا برائی تھی جو اسی تذکرہ کو جو درحقیقت کوئی مفصل تذکرہ بھی نہیں ہے کم سے کم اُردو میں لکھتے نواب صاحب اگر فارسی کے حسرتی تھے تو اُردو کے بھی تو آخر فریفتہ و شیفتہ تھے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ کیا کرتے مرے مٹے بوڑھوں کا نام ہی مٹنا تھا مِٹ گیا۔ یہ تذکرہ

[1] مخالفین مومن و مصنفِ آبحیات کے دوستوں نے اُس کا جواب گلستانِ بیخزاں سے دیا اور خوب خوب بے پر کی اُڑائی مگر نگاہ والوں نے تاڑ لیا اس باسی پھول کے ہار کو اُٹھا کے طاقِ نسیان میں ڈالدیا۔ اور بعض اہل ہوش نے یہ سمجھ لیا کہ استغفر اللہ چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں ؎ کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں ؎ خیر مصنفِ گلستانِ بیخزاں کچھ ہوں کہ نہوں مگر اُنکے ہوا خواہوں کی ہاں میں ہاں ملانے والے پر اتنا تو کہنا ہی پڑیگا کہ ؎ بڈھو میاں بھی حضرتِ گاندھی کیسا تھ ہیں ؎ گو اک چرم استخوان میں یہ آندھی کیسا تھ ہیں ؎ افسوس اگر حسب وعدہ اپنے آج نواب سر امیر الدین خانصاحب بہادر والئے لوہارو میرے پاس کچھ حالات مومن بھیج دیتے۔ یا جناب آغا طاہر صاحب جو آزاد کے پوتے ہیں پچھلے نسبتوں سے آزاد کے مومن پر وہ واقعات جو انہوں نے قلم انداز فرمائے تھے عنایت فرماتے تو سوانح مومن پر کافی روشنی پڑ سکتی تھی۔ اسکے علاوہ متعدد خطوط میں نے اور حضرات کو بھی لکھے مگر کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی آہ ؎ مومن

راز نہاں زبانِ اغیار تک نہ پہونچا ؎ کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہونچا

جسوقت لکھا گیا ہے مومن کے علاوہ غالب و ذوق بھی زندہ تھے۔ مومن نے اسکی تاریخیں بھی لکھی ہیں سنئے۔

جو ترجمہ ایسے تذکرہ کا بھایا مومن کو خیالِ سالِ تاریخ آیا
مضمون کا ہجوم دیکھ کر فرمایا کیا گلشنِ بیخار پہ بادل چھایا
۱۲۵۰ھ

وله

ہاتف نے کہی ہے اسکی تاریخ گلدستۂ گلستانِ معنی
۱۲۵۰ھ

فارسی۔ اردو کی بحث سے الگ ہو کر بھی دیکھو تو اس تذکرہ کی وہ صورت نہیں ہے جو یادگارِ غالب مصنفہ حالی وغیرہ کی ہے۔ یعنی اسمیں صرف کچھ انشا پردازی کی بہار یا دسی انداز کی تعریف ہے اور کچھ کلام۔ بہر حال اسکو بھی غنیمت جانیے کم سے کم اور اساتذہ کی طرح بحالات مومن کا انکشاف تو ہوتا ہے۔ مطبع نولکشور میں صرف چند جلدیں باقی رہ گئی ہیں اہل ذوق منگوا لیں ورنہ پھر اسکا چھپنا معلوم

غرض جب غدر نے دلی کے گلشنِ بیخار کو خزاں کے حوالے کیا اور اسکا بلبل یعنی شیفتہ بھی چہک کر اڑ گیا اور صرف اس باغ کی دیوار کے باہر کے کچھ اونچے اونچے درخت رہ گئے تو ان پر زاغ و زغن نے آشیانہ بنایا۔ کبھی کبھی راتوں کو اونہیں الو بھی بولنے لگے دلی کی عالیشان عمارتوں کی جبینیں زمین کے سینے سے آلگیں۔ قلعہ گورہ بارک ہو گیا بچی بچائی ویران مسجدوں میں ابابیلوں نے گھونسلا بنایا۔ تو ایسے دورِ بدترین میں میدان خالی پاکر شمس العلما محمد حسین آزاد دہلوی شاگردِ خاقانیِ ہند ذوق نے تذکرہ آبحیات بہ زبانِ اردو نہایت ہی اچھوتے اور دلکش رنگ میں لکھا حق تو یوں ہے کہ ایسا تذکرہ لکھا نہیں گیا مگر بے عیب ذات خدا کی وفورِ عقیدت کے جوش میں کوشش کی کہ سارے اساتذہ سے ذوق کو بڑھا دو۔ یہاں تک بھی مضائقہ نہ تھا مگر اساتذہ سلف پر بے جا

نکتہ چینیاں کیں اور بےطرح کسی نہ کسی آڑ میں دھجیاں اُڑائیں۔ کسیکے شرافت کی۔ کسیکے لیاقت اور صورت کی کسیکے علم و فن کی کسیکے کلام کی۔ گو مجکو اسکی تفصیل کا یہاں موقع نہیں مگر چونکہ سب کے ساتھ دوسرے اڈیشن میں مومن کی بھی خبر لی ہے جسکا مجاز ایک شاگردِ ذوق کو نہ تھا نیز ممالک (ریڈی ریفرنس) کو زیادہ پسند کرتا ہو اسلیے ضمناً چند کمزوریوں کو حوالۂ قلم نہ کرنا خونِ انصاف ہے۔ افسوس کہ اساتذہ ذیل کی یادگاروں کے آنسو پونچھ جائیں

نـ۱ حضرت شاہ مبارک آبرؔو۔ جو غوث گوالیاری کی اولاد سے تھے اُنکے طرف یہ مطلع رجوع کیا گیا ہے۔ آبرو کی آنکھ میں ایک گانٹھ ہے ۔۔۔ آبرو سب شاعروں کی ۔۔۔ ہے

نـ۲ حضرت مظہر جانِ جاناں۔ کہ دلّی کے نامی مشایخ سے تھے اُنکا حالِ محبت یوسفِ ثانی میاں تاباں کے ساتھ۔ یا اُن کا کسی دھوبن کا گھر میں ڈالنا۔ اور حدیثِ اُردو کی طرح سوؔدا کی سند میں اک شعر پیش کر دینا۔

نـ۳ میر تقی میر کو کہ سادات سے مشہور تھے نانبائی قرار دینا۔

نـ۴ شیخ امام بخش ناسخ۔ کو اک امیر کا غلام ٹھہرانا۔

نـ۵ بہادر شاہ ظفر کے تین دواوین کو ذوق کا دیوان بتلانا۔

نـ۶ ولی کو کہ نظمِ اُردو کے بابا آدم تھے اک مردِ کم استعداد کہنا۔

نـ۷ میر سوز کو کہ نامی اساتذہ دہلی اور نواب آصف الدولہ کے اُستاد تھے یہ لکھنا کہ تخلص اُنکا بروزن۔ گ۔ و۔ ز تھا۔

نـ۸ خواجہ میر درؔد کہ نامی گرامی مشایخ سے تھے اُنکے نسبت یہ لکھنا کہ کنچنیاں اُنکی بہت مرید تہیں یہ بیچ میں پڑے کی طرح بیٹھے رہتے تھے جب کوئی اعتراض کرتا تھا تو فرماتے تھے یہ میری ماں بہنیں ہیں۔

نـ۹ مرزا دبیر مرحوم کو جنکا مرثیہ اگر بلندی میں چرخِ نہم سے جا ملتا ہو تو روئے

رو لانے میں بھی یکتا ہے۔ یہ کہنا کہ مرثیہ نہیں اللہ ہو بن سعدان کی داستان ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات نہیں تو کیا ہے۔

۳ مرزا غالب بھی ذاتی حملہ سے نہ بچے انکو شیعہ لکھا ہے۔ اسکا جواب حسن نظامی صاحب دے چکے ہیں کہ اگر شیعہ ہوتے تو یہ امرائے شیعہ کے گورستان میں دفن کئے جاتے ساخت بھی ان کے مزار کی جس پر میر مہدی مجروح کا کتبہ ہے ایسی نہ ہوتی انکے شیعہ سنی کی بحث پر اک روایت میں نے دہلی والوں سے سنی ہے کہ غالب جب سخت بیمار ہوئے تو جسطرح اپنے اک سنی شاگرد نواب ضیاء الدین خاں کو لکھا تھا اک شیعہ شاگرد کو بھی لکھا کہ اپنے طریقے پر مجھے دفن کر دینا۔ ان حضرات میں غالب کے مرنے سے پہلے جنگ شروع ہو گئی بالآخر مرزا صاحب نے وہ خطوط واپس منگوا کے پھاڑ ڈالے اور فرمایا جب یہ عالم ہے تو جاؤ میں نہیں مرتا۔

مختصر یہ ہے کہ اہل انصاف ایسے قصوں کو شاعری کے اندر لانا پسند نہیں کرتے اس کے علاوہ ؎

وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے — مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ان اساتذہ کے بعد مومن کے متعلق صفحہ ۲۰۵ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

پہلے دفعہ اس نسخہ میں مومن خانصاحب کا حال نہ لکھا گیا وجہ یہ بھی کہ دور پنجم جس سے انکا تعلق ہے بلکہ دور سوم و چہارم کو بھی اہل نظر دیکھ کر جو اہل کمال اسمیں سے ہیں کس لباس اور شان کے ساتھ ہیں کسی مجلس میں بیٹھا ہوا انسان جب ہی زیب دیتا ہے کہ وہی سامان و شان و وضع و لباس اس کے ساتھ ہو۔ جو اہل محفل کیلئے حاصل ہے نہ ہو تو ناموزوں معلوم ہوتا ہے

اس عبارت کا حرف حرف کا جواب میں دینے کو تیار ہوں مگر اولاً تو مضمون کو طوالت دوسرے یہ کہ لوگ بھی فرمائینگے کہ وفور عقیدت میں مومن کے اک

شاگردنے ذوق کے شاگرد سے لڑائی لی ہے

صورت لفظ خموشی سخن آرائی ہے　　　بے زبانی جو مری ہے وہی گویائی ہے

اب صرف ایک بات اور عرض کرلی ہے یعنی میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ مولانا آزاد نے کوشش کی کہ سارے اساتذہ کو نیچا دکھا کر خاقانی ہند کے نام کو بلند کریں۔ اسکی سند میں انکی عبارت ذیل میں ہے ـ

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا
بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

آبحیات صفحہ ۴۴۲ میں ذوق مرحوم کی شان اجلال رقم فرماتے ہیں۔

جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کے طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں سے تاج سجایا جسکی خوشبو شہرت عام بنکر جہاں میں پھیلی۔ اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آبحیات اس پہ شبنم ہوکر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہونچے ملک الشعرائی کا سکہ اُن کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پہ نظم اردو کا خاتمہ ہو گیا۔

میں کچھ عرض نہیں کرسکتا آج دنیا اہل انصاف سے خالی نہیں ہے خود فیصلہ فرمادیں کہ میں اگر مومن کے ہی متعلق اس عبارت کو لکھوں یا غالب ہی کے طرف اس کو منسوب کروں تو کیا کوئی مانے گا۔

بہر حال حضرات ناظرین گھبرائیں نہیں یہ پُرآشوب منزل ختم ہوگئی آزاد کا احسان سر آنکھوں پہ جنہوں نے عقیدت کا طریقہ بتایا۔ اب دیکھوں میرے دست ضعیف سے مومن کے باب میں کیا ہوسکتا ہے۔ خیر کچھ ہو کہ نہ ہو مگر وقت بڑا مبارک ہے

وہ اس طرح کہ مومن کے کمالات کا فیصلہ کرنے کو اک باخبر جماعت تیار ہوگئی ہے جسمیں ایک راونڈ ٹیبل کانفرنس قایم ہے۔ اور جسکے صدر ہمارے محترم کرمفرما مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی۔ اے۔ ادیب دہلی یادگار مومن و غالب اور اُنکے دائیں جانب ہمارے شفیق مکرم مسٹر ضیا احمد صاحب ایم۔ اے بدایونی لکچرار علیگڈھ یونیورسٹی ہیں۔ یہ حضرات ان کرسیوں پر ہیں جو بالکل جواہر نگار ہیں اب اور کنگا جمنی کرسیاں ہیں جن پر سید امتیاز علی صاحب بی۔ اے۔ حضرت عبدالباری صاحب آسی۔ مرزا جعفر علی صاحب اثر بی۔ اے۔ حضرت نیاز فتحپوری وغیرہ جلوہ فروز ہیں اور اس کانفرنس کا میں اک ادنےٰ خادم ہوں۔ اب تو مومن کے متعلق انصاف ہوکر رہیگا۔ رسالہ اردو حیدرآباد دکن اور رسالہ نگار لکھنو وغیرہ نے بھی اس معاملہ کو مدِ نظر رکھا ہے مولانا نیاز فتحپوری نے تو ایک جملہ میں سر سید احمد خاں کے خیالات کو کوٹ کوٹ کے اڑا دیا ہے یعنی وہ مومن کے باب میں رسالہ نگار مطبوعہ جنوری ۱۹۲۱ء میں لکھتے ہیں کہ اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعرائے متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر یہ استثنائے میر مجکو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہ دوں گا۔ مجھے کلیات مومن دے دو اور باقی سب اٹھا لے جاؤ۔

مختصر یہ کہ اب مومن کی قسمت جاگی ہیں دعا کرتا ہوں کہ خداوند عالم ان حضرات کی توجہ کے ساتھ میری محنت کو رائیگاں نہ کرے اور مومن کے ڈوبتے ہوے بیڑے کو بحر ناقدردانی سے نکال کے کسی گھاٹ لگا دے یعنی اس کتاب کو ہر دل عزیز بنا دے

یہ سبب ہوا اگر غرش کا بھلانا آسان نہیں پچیس ۲۵ برس قبل سے جو تحریک کر تا رہا ہوں آج اسکو اسی کا اثر ماننا پڑیگا ہندوستان کے متعدد اخبارات اور رسالے اور بالخصوص مخزن اور نظام المشایخ وغیرہ صفحہ ہستی پر اسکے شاہد ہیں یعنی ع سنگ میں تھا آئینہ جب سے ہی حیرانی مجھے ہے

آمین ثم آمین ؎

چشمِ کم سے نہ نظرِ مصحفیِ خستہ پہ کر | وہ اگر آیا تو مجلس میں نظیری آیا

شکر صد شکر کہ رواروی میں اُنکے قلم اعجاز رقم سے صفحہ ۱۸۴ میں یہ جملہ نکل گیا کہ خان موصوف کے کمال سے مجھے انکار نہیں۔ اب میں وہی کہونگا کہ پھر یہ بزم اہل کمال میں جگہ پانے کے قابل اگر نہ تھے تو کیوں خیر ؎

پہلے دعوئے خدائی اس بُت کا فر کو تھا | کچھ درستی پر جو آج آیا تو انسان ہو گیا

اچھا تو ناظرین کے سامنے اب کمالاتِ مومن کا فیصلہ اُنکے عہد کے ماہرانِ فن کی تحریریں کر کے ہٹتا ہے۔ جسمیں پہلی رائے تو خدائے سخن مرزا غالب کی ہے جو اپنے ہمنوا کی موت پر یوں آنسو بہاتے ہیں کہ ؎

کافر باشم اگر بمرگِ مومن | چوں کعبہ سیہ پوش نباشم تا عُمر

دوسری رائے سر سید احمد خاں کی ہے۔ جس کو وہ اپنی بہترین کتاب آثار الصنادید میں درج فرماتے ہیں یہ دونوں فیصلے مومن کے متعلق اوسوقت ہوئے جب آزاد کا عدم وجود برابر تھا یہ اُنکی عنائتیں ان بزرگوں کے مرنے کے بعد کی ہیں سر سید کی کتاب پر اعتراف کیلئے مومن کے عہد کے لوگوں میں مرزا غالب۔ علامہ صہبائی۔ مفتی صدر الدین خاں وغیرہ کی تقریظیں موجود ہیں۔ صفحہ ۱۰۶ کی چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

زنگ زدائے آئینہ سخندانی۔ مصقلِ مراتب ملتہ رانی مُحی مراسم کمال مانی کشا و فضل جلوہ دہ عرائس مضامین تازہ زیب وسادہ۔ کمالاتِ بے اندازہ سرمستِ نشئہ سخنوری نظر باز شاہد معنی پروری۔ غواص محیطِ تدقیق آشنائے بحرِ تحقیق پیرایہ پیرائے محامدِ پسندیدہ حُلیہ طرازِ اطوار برگزیدہ۔ غازہ پرداز چہرۂ خُلق محمدی آثار سعادت ازلی و ابدی۔ یگانہ جہاں حکیم محمد مومن خاں مومن تخلص۔

اُنکے کمالات کا اندازہ ظرف شمار سے افزوں اور حیطۂ تعداد سے بیروں ہے معنیٔ تازہ سے قالب الفاظ میں جان ڈالنے اور انفاسِ عیسوی سے معنیٔ پژمردہ کو تازہ از گل اور سیراب تر از گل کرنا ایک شیوہ ہے خاص اسی سخن سنج معانی پناہ کا اور انکے فروغ ضمیر سے الفاظ دری کوکب دری اور اُنکی متانتِ طبع سے سخن ریختہ ایوانِ ریختہ۔ اگر یہ کہا جائے کہ شیرینیٔ زبان حافظ۔ نمک سخنِ سعدی۔ اور متانتِ تراکیب انوری و نشستِ الفاظ خاقانی اور آبانی۔ عبارت ابو الفضل ہندی اور تازگیٔ معانی کمال الدین اصفہانی۔ اور سوا اسکے جو جو خوبی صنفِ شعراسے کسی کے ساتھ منص ہے سب انکے کلام معجزہ نظام میں صرف ہے۔ حق شناسی اور مرتبہ دانی سے بہت بعید اور نہایت دُور از کار ہے حق یہ ہے کہ قسامِ ازل نے سب کو انہیں کے خوان استعداد سے منصب ریزہ چینی اور انہیں کے دیگِ کمال سے وظیفۂ چاشنی گیری عطا کیا ہے۔ زبانِ ریختہ میں وہ کمال مبدا فیاض سے حاصل ہوا ہے کہ سودا اور انکے سخن کے رشک سے جگر اور میر انکے کلام کی خجالت سے مرقد میں سر نگوں ہے۔ قس علی ہذا۔

غالباً ناظرین اب خود یقین کر لینگے کہ صاحب آبحیات نے ایک جواہر بے بہا کو تہ خاک دبا دیا چھپا دیا معنی کہ کتنے بڑے بڑے فضلا کی رائے ایک طرف ہو اور آزاد تنہا ایک طرف ہوں۔ انکے بعد مجکو بہت بڑی شکایت فراق دہلوی[۱] سے ہے جنکی اُمید میں دس سال کا زمانہ بیکار گذر گیا اسکے اندر وہ گیا میں بھی چند بار آئے اور ہمیشہ وعدہ کی بھرمار رہی مگر احوال مومن سے خاکسار کو ممنون فرمایا نہ عزیزان مومن تک کا پتہ بتایا جنکا ذکر آگے آئیگا۔ آخری عنایت نامہ انکا ۲۹ جنوری ۱۹ء میں ملا تھا جسکا نچوڑ یہ کہ ہم فقیروں کو تنگ نہ کرو تیرا خط چاک کر دیا میں دوستِ قلب میں

---

[۱] ناصر صاحب کی تحریر انکے متعلق ملاحظہ ہو۔ ناصر نذیر فراق میر سے عزیز ... کہ انہوں نے کچھ حالات مومن جمع کئے ہیں جنکو بتانے میں اغماض کرتے ہیں جنہر وہ ملفوظات اُنکو مبارک ع خلا خود میزبان ست آرباب توکل را

(جس کو دورۂ جذب کہئے) مبتلا ہوں۔ میں حیات مومن کی ترتیب میں قطعی مدد نہیں کر سکتا۔ بار بار اُن کے صاحبزادہ کو لکھا انہوں نے بھی یہی جواب دیا کہ آپ کا خط والد صاحب کی خدمت میں لے جانے کی ہمت نہیں پڑ رہی ڈرتا ہوں۔ فراق صاحب کی اس تحریر کے بعد خاکسار دہلی گیا جسکا ذکر آگے آئے گا اس وقت وہ اچھے ہو چکے تھے مگر ملنے ملانے کا سوال جو عقل کے نجومی سے کوچہ پنڈت میں کیا تو اس نے صاف جواب دیا کہ مجھے علم نہیں کہ وہ آزاد کے شاگرد ہیں تیری مدد کس طرح کریں کہ حشر میں اُن کو منہ دکھلانا ہے بہرحال ان تمام بدخلقیوں پر بھی میں فراق صاحب کا ممنون احسان ہوں اور انشاء اللہ رہوں گا۔ ع بس ہو چکی نماز مصلے اُٹھائیے۔

تاج الکلام

آنکھ بغیر ملاحت دل اجاڑ ہے　　　چھاتی پہ رات ہجر کی کالا پہاڑ ہے

جب عالم ارواح میں شعرائے اردو فارسی کی روحیں اشتیاق مومن میں مضطرب ہوئیں تو ملائکہ مقربہ خدمت باری تعالیٰ میں حاضر ہوئے اور سربسجود ہو کر عرض کیا کہ اے نکتہ شناس راز سربستہ کیا ارشاد ہوتا ہے؟ (یہ وہ وقت ہے جب مومن بعالم جوانی قفسِ عنصری کی کشمکش اور تکالیفِ دردِ جسمانی سے بیقرار تھے) تو اسوقت حکم رب العزت ہوا کہ فرشتہ موت سے کہو کہ وہ جنت الفردوس سے اک تخت مرصع ایسا لے جائے جسکے چتر کا ایک ایک جواہر سات سات خراج کی قیمت رکھتا ہو اور اس پر مومن کی روحِ پاک کو جو ہمارے حبیب کی ثنائیوں کا سچا پیرو اور شیدائی ہے لا کر شعرائے برگزیدہ و مقبول بارگاہ کی بزم میں ایک امتیازی مقام پر داخل کر دے۔ چنانچہ وہ فرشتہ اک تخت جس کا چتر جواہر نگاری کے سبب بصورت زریں بالِ ہما پر درخشاں تھا سر پر رکھے ہوئے ہوا کے دم پر دست بستہ حاضر ہوا اور مومن کو حکم خدائے عزوجل نیز عالم ارواح کے مقامی شعرا کے اشتیاق سے بھی آگاہ کیا انہوں نے شان عبودیت کے بموجب بسر و چشم اجڑی ہوئی دلی سے اعلیٰ علیین کے قیام کو زیادہ پسند کیا اور بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا کا نعرہ لگاتے ہوئے بحرِ فنا میں قدم رکھ دیا۔ ہوا کے تھپیڑوں نے اس تخت کو آغوشِ محبت میں کشتی کی طرح لیکر فرشتہ موت کی ناخدائی کے سہارے پر دم بھر میں اس مقام معینہ کے قریب پہونچا دیا جہاں کسی بلند پایہ شاعر کا

طایرِ خیال تک نہیں پہونچ سکتا ہے۔
وہاں حکمِ باری تعالیٰ سے حفظِ مراتب کو ایک طرف ظہوری ۔ نظیری ۔ و عرفی ۔ دوسرے طرف ولی ۔ میر ۔ وسودا کی روحیں ایسے نادر موتی لیے کھڑی تہیں جنکا تحفہ ہیرے ۔ لعل ۔ اور زمرد کا تھا غرض یہ تخت رواں اُس بلند امتیازی مقام پر رکھ دیا جہاں سے بامِ عرش کا زینہ ملا ہوا تھا۔ علاوہ ان بزرگوں کے جنکا ذکر آیا ہے شعرائے نامی گرامی کی روحیں حاضر ہوئیں اور سر جُھکا کے اشتیاقِ کلام ظاہر کیا اور دلی کی حالت پوچھی مومن کہ ادب آموز ازل سے تھے اس تخت پر جس کا ذکر آگے آچکا ہے دوزانو بیٹھ گئے اور کہا کہ مدت ہوئی ترکِ سخن کر چکا اب یہ کہ دلی کا حال تو وہاں ایک غالب کا دم رہ گیا ہے یعنی یہی ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ہے جو اس بزم کو روشن کئے ہوئے ہے جہاں صف بستہ شیفتہ ۔ نسیم ۔ صہبائی ۔ ممنون ۔ آزردہ ۔ درخشاں مجروح ۔ وغیرہ بیٹھے فنا کا دم بھر رہے ہیں اور آپ حضرات کا نوحہ پڑھ رہے ہیں اتنے میں شاہ نصیر کی روح پاک سامنے آئی اور ذوق کا حال پوچھا ۔ مومن نے دست بستہ عرض کیا کہ بادشاہ کی مدح اور قصیدہ گوئی میں محو ہیں ۔ یہ سنکر شاہ نصیر کی روح ایک طرف کو چلی گئی ۔
صاحبو" مختصر یہ ہے کہ پیروانِ علمِ حدیث ۔ مشتاقانِ جہاد ۔ طالبانِ جامِ شہادت ۔ کی سچی شان جو مومن کے دیوان سے بھی ثابت ہے یہ اُسی کی برکت تھی کہ خدا نے ان کے جسدِ پاک کو احاطہ مولانا شاہ عبد العزیز و مولانا شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے قرب میں پہونچا دیا جہاں سے وہ ان علما کے ساتھ حشر میں اُٹھائے جائینگے اور اُن کی روحِ پاک وہاں پہونچا دی گئی جہاں آٹھوں پہر آبِ حیات کے عوض بارشِ رحمت ہوتی رہتی ہے اُن کی بزم وہ بزم ہے جہاں ہر وقت باغِ بہشت کے جھونکے پہونچتے

رہتے ہیں۔ جہاں گلشن فردوس کے تر و تازہ پھولوں سے رنگ برنگ کے گلدستے سجائے جاتے ہیں۔ جہاں حوریں بناؤ سنگار کئے بیٹھی ہوئی خود ان کی غزلیں گایا کرتی ہیں۔

غرض حق بہ حقدار رسید۔ اہل عشق کے جو مرتبے ہوا کرتے ہیں وہ مومن کو مرنے کے بعد حاصل ہوئے اور اُسی عشق کے زینے سے یہ زمین سے آسمان پر پہونچ گئے اب اور کسی کو دنیا کی ملک الشعرائی اور مملکت شعر کی بادشاہی مبارک ہو جو اس بلندی کے آگے پستی ہے۔ یہاں تو ؎

خود رفتگی میں چین وہ پایا کہ کیا کہوں
غربت جو مجھ سے پوچھو تو بہتر وطن سے ہے

حالاتِ مومن

خاندان۔ وطن۔ صورتِ معاش۔

آپ علوی سادات[1] نجبائے کشمیر سے ہیں۔ اصل وطن آپ کے بزرگوں کا کشمیر ہے جسوقت کہ شاہ عالم کی سلطنت کا چراغ خاموش ہونے کو بھڑک رہا تھا آپ کے بزرگوں میں دو بھائی حکیم نامدار اور حکیم کامدار۔ دہلی میں آئے اور شاہی اطبا میں داخل ہو کے خانصاحب کے خطاب سے ممتازِ دربار ہوئے۔ یہ لوگ جب دلی میں آئے تو کوچہ چیلاں میں جہاں اُن دنوں اکابرِ روزگار کا مسکن تھا قیام کیا۔ اور یہاں وہ راحت پائی کہ پھر وطنِ قدیم کو نہ پلٹے صلۂ خدمت میں بادشاہ کے طرف سے پرگنہ نارنول کے چند مواضعات جس میں موضع بلاہہ بھی تھا بطور جاگیر عطا ہوئے کچھ دنوں بعد ان دونوں بھائیوں کی نام پر دو خاندان ہو گئے۔ یعنی نامدار خانی اور کامدار خانی۔ نامدار خانی میں مومن خاں ہوئے اور کامدار خانی میں مسیح الملک حکیم اجمل خان وغیرہ ہوئے۔ مومن کے یہ بزرگ صرف شاہی حکیم نہ تھے بلکہ ان سے وزارت صوبہ داری سر صوبہ۔ وغیرہ کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ یہ حضرات جب اس خدمت کے سلسلہ میں صوبہ بہار کے طرف آئے تو چند مسجدیں بھی تعمیر کرائیں۔ (چنانچہ نوادا ضلع گیا میں ایک مسجد انکے نام پر ہنوز موجود ہے مگر یہاں بجائے صوبہ دار کے انکے ناموں کیسا تھ

---

[1] تذکرہ شعرا۔ مولفہ نواب صدیق حسن خاں والئے بھوپال۔ اور یہ تصدیق اُنکے نواسہ مومن جناب سید ناصر جلیب صاحب۔ وکیل ریاست دتیا ضلع بُندیلکھنڈ کا خط دیکھو جسمیں وہ اسکی تصدیق فرماتے ہیں نیز ہندوستان میں آج سینکڑوں ایسے ہیں جو خانصاحب اور خان بہادر کے خطاب کی بدولت سید سے پٹھان مشہور ہو گئے۔ مختصر یہ کہ مومن پٹھان نہ تھے۔

راجہ مشہور ہے۔ بہرحال یہ سب انقلابات ہستی کے تاثیرات ہیں۔ رعایا نے امرالو راجہ کہا تو کیا غلطی کی۔ خیر جب سرکار انگریزی نے جھجھر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو دے دی تو پرگنہ نارنول بھی اُسی کے ساتھ ساتھ نکل گیا اب کہ شاہی اثر معدوم ہو گیا تھا نواب نے ہزار روپیہ معہ وریجان کر اُنکی جاگیر خاندانی ضبط کر لی اور صرف ہزار روپیہ سالانہ پنشن اس خاندان کی مقرر کر دی چنانچہ حکیم مومن خاں کو کہ حکیم غلام نبی خان وار حکیم نامدار خاں کے بیٹے تھے پانسو روپیہ ترکہ خاندانی حاصل ہوا اسکے علاوہ اُنکے خاندان کے چار طبیبوں کو سرکار انگریزی کے طرف سے بھی سو روپیہ ماہوار کی پنشن مقرر ہو گئی جسکے ایک چوتھائی کے وارث حکیم مومن خاں ہوئے۔ غرض یہ ممتاز خاندان عہد شاہی سے لیکر غدر سے پہلے تک نہایت فارغ البالی کے ساتھ امیرانہ زندگی بسر کرتا رہا اور اس خاندان کا ہر طبیب شاہی خصوصیت کے سبب رئیسانہ شان و شوکت رکھتا تھا چونکہ حکیم نامدار خاں کا خاندان علم آبائی کے لحاظ سے حکیم مومن خاں کی ذات پر تمام ہو گیا اسلئے اُنکی اولاد نابرہی اور گمنامی کی حالت میں پڑ گئی۔ دوسرے طرف برعکس اسکے حکیم کامدار خاں کا خاندان ہے جسمیں مسیح الملک کی پھونکی ہوئی روح حشر تک کام کرتی رہےگی ع میراث پدر خواہی علم پدر آموز۔

ناظرین یہی وہ سبب تھا کہ مومن اپنے عہد کے برائے نام [note] بادشاہ یا کسی نواب یا رئیس کے محتاج نہوتے گھر بیٹھے جو میسر آتا تھا اُسی کو بہت سمجھتے تھے انہوں نے اطبائے عام کیطرح مطب بھی نہ کیا نہ حکمت کی روٹی کھائی کبھی کوئی علاج معالجہ کیلئے رجوع ہو جاتا تھا تو انکار بھی نہ کرتے تھے آجکل کیطرح اُس زمانہ میں کوئی

[note] سلطنت بیجان سی تھی اسلئے بادشاہ کے مصاحبوں کو جیسے ذوق ہی تھے مومن سگان جیفہ خوار کہتے تھے۔ اور ذوق انہماف برنہ آگے بگڑتے تھے۔ یہ بھی سبب نفاق کا ہے

فیس نہ بھی غربا کا علاج مفت کیا جاتا تھا امرا جو بطور نذر حقِ خدمت دے دیتے تھے وہ لے بھی لیتے تھے۔

ولادت - نام - اور تعلیم -

سنہ ۱۲۱۵ھ انکا سنِ ولادت بتایا جاتا ہے۔ اُسی محلہ میں جسکا ذکر اوپر آچکا ہے پیدا ہوئے یہیں حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کا مدرسہ بھی تھا اور اسی کے قریب حکیم غلام نبی خاں کا مطب بھی۔ اسلیے ان حضرات میں مراسم تھے۔ چنانچہ جب مومن پیدا ہوئے تو اُنکے والد شاہ صاحب کو بُلا لائے اور انہیں سے کان میں اذان دلوائی اور نام کیلئے کہا تو شاہ صاحب نے مومن علی نام رکھ دیا۔ گھر والوں کی طرف سے دوسرا نام حبیب اللہ پیش کیا گیا مگر شاہ صاحب نے فرمایا نہیں۔ عورتوں نے پھر دست بستہ عرض کیا کہ حضور مومن تو جولاہے کو کہتے ہیں کوئی اور نام رکھ دیجیے حضرت نے فرمایا نہیں اسی نام سے یہ دنیا میں نام پائیگا۔ آخر وہی ہوا یہاں تک کہ جب یہ شعر کہنے لگے تو تخلص بھی مومن ہی رکھا اور اُنکے اُستاد نیز دوستوں نے بھی اسکو پسند کیا۔ اور جب سب نے پسند کیا تو خدا کو بھی مقبول ہوا یہاں تک کہ یہ اپنے اعمال صالحہ کے بدولت واقعی حبیب اللہ ہوئے اور بشان مومن دنیا سے اُٹھے۔ سچ ہے ع عملِ نیک ہی انسان کے کام آتے ہیں۔

تعلیم بھی اُنکی اسی مدرسہ میں ہوئی کچھ کتابیں تبرکاً شاہ عبدالعزیز صاحب اور بقیہ مولانا شاہ عبدالقادر سے پڑھیں۔ اور یہیں عربی۔ فارسی۔ حدیث۔ فقہ۔ منطق۔ معانی وغیرہ کی تکمیل ہوئی۔ ذہن خداداد کا یہ عالم تھا کہ شاہ صاحب کے واعظ جو علاوہ علوم ظاہری کے نکات باطنی سے بھی بھرا ہوتا تھا جو ایک روز سن لیتے تھے تو بے فرق دوسرے روز اپنے والد کے مطب میں بیٹھ کے دوہرا دیتے تھے سوا اسکے یہ تھا کہ مومن نکات باطنی اور اسرار سینہ کو بھی اسی طرح بیان کر دیتے تھے جسکی بابت حضرت

شاہ صاحب کی تفسیر ناتمام میں موجود ہے ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را
مومن اپنی ذہانت میں بحر مولوی محمد اسمٰعیل صاحب شہید یا خواجہ محمد نصیر رنج کے اپنا ہم پایا کسیکو نہ سمجھتے تھے

طبیعت انکی ازل سے بہت رفعت پسند واقع ہوئی تھی۔ یہی وہ سبب تھا کہ سعدی کی گلستاں کو بھی جو ذکر آجاتا تھا تو یہ کہتے تھے کہ رفت۔ رفت۔ گفت گفت۔ کے سوا اسمیں کیا دھرا ہے یہ فرمانا انکا کسی نخوت کے سبب نہ تھا بلکہ اپنی طبیعت کے وہ کیا کرتے بچپن ہی سے ظفر اور ظہوری کی طرف جھکاؤ تھا۔ میر تقی صاحب کیطرح بدد ماغیوں کے الزام سے یہ بالکل پاک رہے۔ نہ کسی مورخ نے انکی شکایت لکھی نہ اوروں کیطرح کسی سے تو تو میں میں ہوئی۔ ایک جگہ آزاد نے جو آغا جانی ہُدہُد کے گھونسلے میں مومن خانی باز کا گھس جانا بیان کیا ہے سخن فروشی ہے اسلئے کہ مومن کے شاخسار سخن ہیں الو۔ زاغ و زغن۔ باز بھری کہاں وہاں تو عشق اور آہ آہ کے فیضان سے صرف کو ئیلوں قمریوں اور پپیہوں کا گھونسلا تھا۔ اور انہیں کے دردناک نغمے سننے بھی جاتے تھے۔

اک مغموم طبیعت انسان جو زخم خوردہ ہو قدرتی طور پر زندہ دل نہیں ہو سکتا اس مصنوعی قصے سے غرض آزاد کی ایسی قدر ہے کہ وہ حکیم آغا جان کے مقابلے میں مومن کو شکست دیں مگر دنیا آج بھی بخوبی اس فیصلہ کو تیار ہے کہ حکیم آغا جان عیش اور مومن میں کیا فرق تھا۔ اگر یہ واقعہ صحیح بھی ہو تو ہُدہُد کے پر دیال باز نے نہ نوچے ہوں یہ کیسے مانوں۔ بہرحال جب مومن اچھے خاصے عالم ہو گئے تو خاندانی فن

سلہ عیش کے ان شعروں سے خود پتہ چل جائیگا کہ ان میں اور مومن میں زمین و آسمان سے زیادہ کا فاصلہ ہے

زہد و تقوے دھرے رہے سارے — ہاتھ سے اُسکے مے پیتے ہی بنی
کس کا تھا پاس شوق ظلم اے عیش — ان جفاؤں پہ بھی جیتے ہی بنی

کے طرف رجوع یعنی اپنے والد اور چچا غلام حسن خاں اور حکیم غلام حیدر خاں سے طب کی تکمیل کی۔ اور انہیں کے مطب میں طریقہ تشخیص کے ساتھ نباضی اور نسخہ نویسی بغور سیکھی اور ان بزرگوں کے انتقال کے بعد اُنکے جانشین ہوئے اس فن میں یہ آبرو پائی کہ اب تک طب کی بڑی بڑی کتابوں میں اُنکے نام پر نسخے موجود ہیں۔ درحقیقت یہ اُنکی انتہائی ذہانت تھی کہ یہ موجدان فن طب کے نقش پا تسلیم ہوئے اور صاحب تصنیف بھی ہوئے

نجوم اور شطرنج وغیرہ

اسکے بعد یہ علم نجوم و رمل وغیرہ کے طرف جھکے اٹھیں وہ وہ کمالات دکھلائے کہ حد بیان سے باہر ہے انشاء اللہ اُسکا ذکر آگے آئیگا۔

اب یہ تفریح طبع کیلئے شطرنج کے طرف مایل ہوئے اس فن میں بھی وہ کمال پیدا کیا کہ دہلی کے مشہور شاطر کرامت علیخاں کے سوا جو انہیں کے گھرانے کے تھے اور کوئی اُنکی نظر میں نہ جچتا تھا۔ دلّی اور غدر سے پہلے کی دلّی جہاں گھر گھر اُمرا اور شرفا نے بساط نشاط بچھا رکھی تھی یہ انکا معمولی کمال نہ تھا کہ شہزادہ مرزا رحیم الدین حیاؔ کو جو زینت کے ذریعہ سے حل کرنے کیلئے ولایت کے آتے ہوئے مشکل نقشے لا کرتے تھے وہ دیکھ کر یہ جو فتح و شکست کا حکم لگا دیتے تھے وہ گویا پتھر کی لکیر کی طرح ہمیشہ کیلئے قایم ہو جاتا تھا۔ اس فن میں انہماک کی یہ صورت تھی کہ صبح کو بیٹھے تو چراغ جل گیا اگر شام کو بیٹھے تو صبح ہو گئی کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہتا تھا کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بساط کے کسی خانہ سے پیادہ کے ساتھ صبح کو نکلے تو منزل طے کر کے دوسری صبح کو گھر پلٹے۔ شہزادہ مرزا رحیم الدین حیاؔ اس فن میں اُنکے شاگرد رشید تھے یہ وہی حیاؔ ہیں

؎ حیاؔ کے دو شعر بطور یادگار حاضر ہیں سُن لو پھر ان بڈھوں کا نام کون لیگا ؎

موت ہی چارہ ساز فرقت ہے | رنج مرنے کا۔ تجکو راحت ہے
تم بھی اپنے حیاؔ کو دیکھ آؤ | آج اُسکی کچھ اور حالت ہے

جو عہد نواب یوسف علیخاں میں دھلی سے رام پور گئے اور پھر نہ پلٹے۔ ان کا خاندان ہنوز وہاں موجود ہے۔ شیخ امیر اللہ تسلیم مرحوم بیان فرماتے تھے کہ وہ ایک مرتبہ غدر سے پہلے جب نواب کلب علیخاں بہادر ولی عہد تھے ایک مشاعرہ میں شریک ہوئے دیکھا کہ ایک امتیازی مسند پر شہزادہ صاحب موصوف بیٹھے ہیں جب میں نے یہ مطلع پڑھا ہے کہ ؎

یادگار ہستی موہوم ہم رکھتے نہیں   صورت عمر رواں نقش قدم رکھتے نہیں

تو شہزادہ صاحب نے پیچوان چھوڑ دیا اور پوچھا کہ آپ کے شاگرد ہیں میں نے کہا نسیم شاگرد مومن ۔۔۔ یہ سن کے فرمانے لگے آپ خوب کہتے ہیں وہی ہیں حیران تھا کہ لکھنو والے اس رنگ کو کیا جانیں وہ تو انگیا کرتی کے مضامین خوب کہتے ہیں۔

شہزادہ صاحب کا ذکر مسمی اسمٰعیل منیر شکوہ آبادی شاگرد ناسخ و رشک مقیم رامپور نے بھی کیا ہے۔ اور انکی مثنوی کی تعریف کی ہے۔

مومن شطرنج اور رمل وغیرہ کے شوق کے بعد بھی چلن سے نہ بیٹھے۔ علم موسیقی ریاضی صنعت و حرفت میں سادہ کاری میں آتش بازی وغیرہ میں بھی ایجاد کا مادہ انہوں نے پیدا کیا۔ ان فنون سے دلچسپی رکھنے والے مومن خاں کے دربار میں برابر آیا کرتے تھے۔ اور فیضیاب ہوتے تھے۔ سادہ کاری کی چیزیں خود انکی بنائی ہوئی ان کے خاندان میں موجود ہیں

اب ناظرین خود فیصلہ فرمائیں کہ ایسا جامع علوم و فنون شاعری کی طرف رجوع ہوتا ہے پھر وہ کس پایہ کا شاعر ہوگا اور اسکے اشعار کس طرح عام فہم ہو سکتے ہیں غرض۔ ہم اسے روشنی طبع تو بر من بلا شدی۔

کثرت علوم و فنون نے انکو اور بھی نازک خیالی اور مشکل پسندی نیز داخلی مضامین کی طرف جھکا دیا تھا یہی سبب ہوا کہ آج انکا کلام زبان زد خاص و عام نہیں پھر بھی

غالب کیطرح (جو علوم و فنون میں اُنکے برابر نہ تھے اور جنکی شہادت کو صفحاتِ تاریخ موجود ہیں) انکا کلام بھی اگر انکے معاصر اُنکی حیات میں یا اُنکے بعد لے لیتے اور انتخاب کر دیتے تو ہرگز یہ گوشہ گمنامی میں نہ ہوتے۔ کسے کم بینا لیکے پہلو بہ پہلو ضرور نظر آتے یہ بھی نہ سکے۔ مومن کو حیات محض مختصر ملی ورنہ وہ خود اپنی پیری کو پہنچ کر اسکو مجموعہ کر لیتے کہ دنیا کا مذاق بدل گیا ہے نیز آگے چل کر اور بھی بدل جائیگا۔ بہرحال نیر اگر یوں نہ ہوتا اور وہ ہوتا اس مرثیہ خوانی سے کیا ہوتا ہو سکے کم اگر یہ استغنائی کو چھوڑ دیتے تو آج گھر اشرفیوں سے بھرا ہوا ہوتا مگر جب مقدر کا یہ عالم تھا کہ غزلوں تک کے کاغذ یارانِ طریقت لے بھاگے تو کیا ہو میسری نوٹ چھوڑ دیتے۔ صغیر سن بچے کسکا گٹا تھا ہے اب روتے ہو حشر تک رویا کرو۔ سر پیٹا کرو۔ کیا ہوتا ہے۔

علمِ نجوم اور رمل کا کمال۔

نجوم ہو کہ رمل بغیر زائچہ کام نہیں دیسکتا۔ اور یہاں یہ عالم تھا کہ اطمینان اور یکسوئی تو در ایک ہی صحبت میں شاعری۔ شطرنج۔ طب۔ موسیقی۔ ریاضی۔ صنعت و حرفت وغیرہ کا مذاق رکھنے والے صف بستہ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں روئے سخن ایک کیطرف نہیں اور سائل کا جواب ہو کہ دیا جا رہا ہے

کبھی ایسا بھی ہوا کہ صرف سائل کی صورت دیکھ لی اور اجازتِ سوال نہیں تقویم سال میں سرسری طور پر ایک بار دیکھ لیتے تھے۔

انکے رفیقِ قدیم شیخ عبد الکریم نے آنکھوں کی دیکھی باتیں لکھ کے مصنف آبحیات کو بھیجی تھیں جسکو وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے داخلِ دفتر کر دیا۔ صرف ایک واقعہ لکھا کہ ایک دن کوئی غریب ہندو نہایت بیقرار و پریشان آیا اُس نے خانصاحب سے کہا کہ صاحب میں لُٹ گیا۔ یہ اُس کا منہ دیکھنے لگے اور فرمایا بس خاموش رہو۔ کیا تمہارا کچھ مال جاتا رہا ہے وہ گھبرا کے بوکھلاہٹ میں چھاتی پیٹ کے کہ اُٹھا حضرت کیا کہوں لُٹ گیا۔

مومن خان پھر بولنے کو منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو میں کہوں اُسے سنو۔ جو غلط ہو اُس سے انکار کر دینا۔ پھر پوچھا کہ زیور کے قسم سے تھا۔ وہ کہتا ہے صاحب ہاں عمر بھر کی کمائی تھی کہا کہ تمنے لیا ہے یا تمہاری بی بی نے۔ کوئی غیر تو چرانے نہیں آیا۔ اُسنے کہا میرا مال تھا بی بی کے پہننے کا زیور تھا ہم کیوں چراتے یا وہ کیوں چھپاتی۔ ہنس کر فرمایا کہ کہیں رکھ کے بھول گئے ہو۔ مال باہر نہیں گیا اُسنے کہا صاحب سارا گھر ڈھونڈھ مارا کوئی جگہ باقی نہیں۔ کہا۔ جاؤ اور پھر دیکھو۔ وہ گیا اور پھر سارے گھر میں اچھی طرح دیکھ آیا۔ کہنے لگا حضرت میرا چھوٹا سا تو گھر ہے ایک ایک کونہ دیکھلیا کہیں پتہ نہیں۔ خانصاحب شطرنج کھیلنا چھوڑتے ہیں اور اسکے طرف توجہ کے ساتھ رجوع ہوتے ہیں اور کہتے ہیں تم غلط کہتے ہو۔ وہ کہتا ہے آپ چلکر خود تلاشی لے لیجئے میں تو ڈھونڈھ چکا یہ سنکر اُسکے۔ سارے گھر کا نقشہ بیان کرنا شروع کر دیا جیسے مومن اسکے گھر میں کھڑے ہوں بتایا کہ دیکھو۔ گھر میں جنوب کے رخ جو کوٹھری ہے اُس میں شمال کے طرف ایک لکڑی کا مچان ہے اُسکے اوپر تمہارا مال موجود ہے وہ کہتا ہے پیر و مرشد اُس مچان کو تو میں نے تین بار چھانا ہے وہاں نہیں ملا فرمایا اُسی کے ایک کونے میں مال پڑا ہوا ہے غرض وہ پھر دوڑتا ہے اور جب روشنی جلا کے دیکھتا ہے تو ڈبا زیور کا جوں کا توں وہیں پاتا ہے اور خوش خوش آ کے خبر کرتا ہے کہ حکیم جی ہمارا مال مل گیا۔

کہیے یہ نجوم ہے یا کشف۔ حقیر عرش جب آپکی پوتی صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُنھوں نے اس قصہ کو بھی سُنایا نیز وہ یہ بھی کہتی تھیں کہ وہ عامل تھے۔ گنڈے تعویذ کی بھی اُن کے دھوم تھی پھر ارشاد فرمایا۔

کفر پر جبکہ ہے اسلام ازل سے غالب
آپ مٹ جائینگے مومن کے مٹانے والے

رمل کا کمال

شب کم تھا اور قصۂ انکا دراز ورنہ　　احوالِ میر صاحب ہم تمکو سب سناتے

خانصاحب کا دربار لگا ہوا ہے مختلف علوم و فنون کے شایق دامنِ طلب پھیلائے ہوئے بیٹھے ہیں ایک طرف حکیم سکھانند راقم بھی مؤدب بیٹھے ہیں۔ یہ رمل میں خانصاحب کے شاگرد ہیں۔ دیوار پر ایک چھپکلی نظر آتی ہے خانصاحب راقم کو فرماتے ہیں ہئی ذرا دیکھنا یہ چھپکلی دیوار سے کب تک ہٹیگی وہ زور لگا کے کہتے ہیں حضور یہ ابھی جاتی ہے خانصاحب شطرنج کھیل رہے ہیں مگر مسکراتے ہیں اور دیوار کے طرف دیکھ کے حکم لگاتے ہیں واہ جب تک پورب سے اسکا جوڑا نہ آجائے کیونکر جائیگی۔ دیکھو اور پھر دیکھو گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد بالاخانہ پر جہاں خانصاحب جلسہ جمائے بیٹھے ہیں ریشمی کپڑوں کے دو گٹھے لیئے ہوئے ایک سوداگر آتا ہے (خانصاحب کو ریشمی کپڑوں سے ازلی ذوق تھا اور کم سے کم پاجامہ ریشمی ضرور پہنتے تھے) سوداگر مزدور کے سر سے جیوں ہی ایک گٹھا کپڑے کا پورب والے دروازے سے داخل ہو کر کمرے میں اُتارتا ہوگا گٹھے سے ایک چھپکلی پٹ سے گرتی ہے اور دوڑ کر دیوار والی چھپکلی سے جا ملتی ہے پھر دونو چھپکلیاں مل ملا کے ایک طرف کا راستہ لیتی ہیں۔ راقم خانصاحب کا عالمِ تحیر میں منہ دیکھتے ہیں اور وہ مسکرا کے فرماتے ہیں۔ میاں ہنوز دلی دور ہے تم چاہتے ہو شاعری[سلہ] کی طرح اسکو بھی حاصل کر لوں تو یہ مذاق نہیں۔

افسوس آج دلی خاک میں مل گئی۔ سر دے مارا مگر ان واقعات کے بتانے والے نہ ملے۔ کہ ناظرین کی دلچسپی بڑھاتا۔ بیں اطرافِ ہندوستان میں تحریک کرتے کرتے تھک گیا کہ بھئی جن صاحبوں کو خانصاحب کے کمالات سے واقفیت ہو مجھے سرفراز فرمائیں مگر ہائے اس کے جواب دینے والے نہ رہے ہم سے بہت پہلے وہ کاروان چل بسا اور اُن کے نقشِ پا کو بھی صرصر اور بگولوں سے

[سلہ] راقم۔ کا اک شعر سن لو اور اسی سے اُن کی شاعری کا اندازہ کر لو ؎

عدم سے کوچۂ قاتل کی راہ ملحق ہے　　گیا اُدھر جو گذر پھر ادھر نہیں آیا

مٹا ڈالا ؎

صورتیں آنکھوں میں جو تھیں مرٹوں کی مٹ گئیں
عرش اُن کا کس طرح نام و نشاں پیدا کروں

حلیہ اور وضع۔

میانہ قامت۔ سرخ و سفید سبزی مایل سیب کا سا رنگ تھا (جو اکثر کشمیریوں میں پایا جاتا ہے) بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ لمبی لمبی پلکیں۔ پتلے پتلے ہونٹ۔ لمبی ستواں ناک۔ مسی آلود دانت۔ ہونٹوں پر پان کا لاکھا۔ ہلکی ہلکی مونچھیں خشخاشی داڑھی۔ بھرے بھرے بازو۔ پتلی کمر۔ چوڑا سینہ۔ لمبی لمبی انگلیاں۔ سر پر گھونگر والے لمبے لمبے بال زلفوں کی صورت میں پشت اور شانوں پر بکھرے ہوئے کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کاکلوں کی شکل رکھتی تھیں۔ کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیتے تھے۔ پیشانی بلند تھی مختصر یہ کہ آج بھی (امۃ الفاطمہ بیگم عرف صاحب جی) کے مزار سے انکی طرف کنایہ کرتی ہوئی یہ آواز آتی ہے کہ ؎

حُسن سبز است بخطِ سبز مرا کرد اسیر   دام ہمرنگ زمین بود گرفتار شدم

اس حسن و جمال کے آدمی بہت کم دیکھے جاتے ہیں اُس پر وضعداری قیامت ڈھا رہی تھی اور یوں کہئے کہ ساری دلّی میں یکتا تھے۔

بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا اُسکے نیچے کرتا نہ ہوتا تھا۔ گلاب کا سا جسم انگرکھے کے پردے سے یوں دکھلائی دیتا تھا جیسے سفید شیشے میں سے اُبھر گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ اُسمیں چھوٹا سا سنہری تعویذ۔ کاکریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دیکر کمر میں لپیٹ لیتے تھے اور اُسکے دونوں سرے سامنے پڑے رہتے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت نقرئی اکثر ہوتا تھا۔ پاؤں میں عہد شباب تک سرخ گلبدن کا پاجامہ مہریوں سے کچھ تنگ اور اُدھر سے ڈھیلا جیسا اب بھی کشمیری پہنتے ہیں چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

غریق گریۂ خونیں رہا نہ کر مومن　　　لباس یعنی پہنتے نہیں مسلمان سرخ

ادھر آپکے ایک بر لسادہ پاجامہ بھی پہنتے تھے مگر نیفہ اُسکا سرخ ریشمی کپڑے کا ضرور ہوتا تھا۔ انگرکھے کی آستین آگے سے ایک بالشت کٹی ہوئی اُسکو یا تو اُلٹ کے چڑھا لیتے تھے خواہ لٹکی ہوئی ہوتی تھیں۔ سر پر گلشن کی پنج گوشیا کی ٹوپی اُسکے کنارے پر ایک سفید ریشمی لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی ہوتی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آجاتی تھی اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال شیشے کے بال کی طرح صاف نمایاں ہوتے تھے۔ غرض یہ کہ نہایت خوش پوشاک اور نہایت جامہ زیب تھے۔ شعر پڑھتے وقت ٹوپی کو اوردبا لیتے تھے اور گھونگر والے بالوں　انگلیوں سے کنگھی کرتے رہتے تھے۔

سید حیدر علی دہلوی۔ خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی سے یہ اپنی آنکھوں کی دیکھی ہوئی بیان کرتے تھے کہ میرا گھر مومن خانصاحب کے گھر کے پاس تھا۔ میں نے خانصاحب کو بہت دیکھا۔ ایسا شوقین آدمی دلّی میں نہ تھا۔ جدھر سے وہ گذرتے تھے لوگ تصویر کی طرح اُنکو دیکھنے لگتے تھے۔ راہ میں جب وہ فکرِ شعر میں ہوتے تھے تو اُنکی اُنگلیوں کو حرکت رہتی تھی۔ اسی طرح ہمارے دیرینہ محترم مرزا انشا علی شہرت دہلوی جو کچھ دن مخزن کے بھی ایڈیٹر تھے فرماتے تھے کہ میں نے مومن کو اچھی طرح دیکھا اور صحبتیں اُٹھائی تھیں۔ اُنکو عطر اور پھولوں سے بہت شوق تھا۔ جس گلی سے وہ گزر جاتے تھے معطر ہو جاتی تھی۔ اور لوگ جان لیتے تھے کہ ہو نہ ہو مومن خاں ہیں۔ عرصہ سے مرزا صاحب کے خطوط نہیں آئے۔ خدا رحم فرمائے۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ میں مومن کا بہت کچھ حال لکھ کے بھیجونگا۔ ہائے وہ محترم زمانہ اور متبرک ہستیاں خواب ہو گئیں۔

ما ندانیم کہ منزلگہ مقصود کجاست　　　اینقدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کو خدا قایم رکھے جنکی بدولت مومن کی تصویر آج صفحہ ہستی پر ہے۔ حضرات ناظرین اب میرے بیان کو پرانی تاریخوں سے مطابق

کر کے تصویر مومن سے ملا لیں۔ میری راست گوئی اور سخن فروشی کا پتہ چل جائیگا۔

غالباً ایسی ہی پاک صورتوں پر مولانا آسی سکندرپوری نے یہ فرمایا ہے کہ ؎

وہ مصور تھا کوئی یا آپکا حسن شباب — جسنے صورت دیکھ لی ایک پیکر تصویر تھا

اسکے علاوہ دہلی والوں کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ مرزا غالب ایک مرتبہ مزار مومن پر گئے تو بہت روئے اور بے اختیار یہ شعر فرمایا کہ ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں — خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

رہائش کا امیرانہ انداز۔

سچ ہی بڑوں کی بڑی بات چیلوں کے کوچے میں خانصاحب کا آبائی مکان حکیم آغا جان کے چھتے کے سامنے تھا۔ بڑا سا دروازہ۔ اندر بہت وسیع صحن اُسکے چاروں طرف عمارتیں دو طرف دو صحنچیاں۔ سامنے بڑے بڑے دالان پچھلے دالان کے اوپر کمرہ۔ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرے کا صحن کر دیا تھا۔ منڈیر بہت چھوٹی رکھی تھی کہ نیچے کے حصے میں ہوا اور روشنی پہونچ سکے۔ ایک دالان میں چاندنی کا فرش تھا۔ اندر کے دالان کے بیچوں بیچ قالین بچھا ہوا۔ قالین پر گاؤ تکیے سے لگے ہوتے حکیم مومن خان اُسی لباس میں جسکا ابھی ذکر کیا گیا بیٹھے تھے۔ چاندی کا حقہ طشت میں سامنے ہوتا تھا اُنکے ارد گرد شہزادے۔ امیرزادے شعراء طبیب اہل نجوم۔ صنعت و حرفت کے شیدا۔ سوداگر۔ وغیرہ وغیرہ مودب رہا کرتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے امیر کا دربار لگا ہوا ہے۔ ہائے کل کی باتیں کہانیاں ہوگئیں۔

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ — سن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ

جس طرح مومن کے دیکھنے والے آج خاک نشین ہیں۔ کل اپنا بھی کسی تکیہ میں بچھونا ہوگا۔ مومن تو خوش قسمت تھے جنکا ایک صدی بعد ہم ماتم کرنے بیٹھے ہیں

یہاں تو اپنی بالین پر کوئی دو آنسو بہانے والا نہوگا۔ بدمذاقی سے میری تصنیف تک دیمک خوردہ ہوکے خاک میں مل جائیگی۔ دیکھو شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی کو جنہوں نے میر و سودا کے عہد میں آبروپائی تھی آج پٹنہ میں اُنکے مزار تک کا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ اُنکا دیوان تک ناقدردانی کے طاق میں پڑا ہے کچھہ جزو اُٹھا لے گئے۔

مومن کی شادی۔

مجکو تذکرہ بطور کلیم کا حوالہ دینے کی محتاجی نہیں نہ فراق صاحب کی منت کی ضرورت ہے اسلئے مومن کے خاندان والے مل گئے ہیں۔ چنانچہ آپکی پوتی صاحبہ اور آپکے نواسے فرماتے ہیں کہ اُنکی شادی میر محمد نصیر محمدی۔ رنج خلف میر کلو نبیرہ و سجادہ نشین خواجہ میر دردؔ کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ چنانچہ آپکو اس خاندان سے کچھہ جائداد اور ایک حویلی بھی رہنے کو ملی تھی جسکو مومن خاں نے اپنی حیات میں اسلئے فروخت کردیا کے اُنکو سسرالی مکان کی محتاجی نہ تھی۔ بہرحال مومن کی یہی ایک بی بی تہیں۔ اور انہیں کے بطن سے صاحبزادہ احمد نصیر خاں اور دو لڑکیاں ہوئیں۔ جنکا بالتفصیل ذکر آگے آئیگا۔

خواجہ محمد نصیر رنج کو سرسید احمد خان مرحوم نے بھی دیکھا تھا اور اُنکے نسبت لکھا ہے کہ وہ ایک صاف باطن درویش اور دہلی کے مشہور و معروف مشایخ سے تھے رنج مرحوم کے دو شعر بھی بطور یادگار درج کئے دیتا ہوں پھر موقع ملے نہ ملے۔

خط دیکھکر ادہر تو مرا دم اُلٹ گیا — قاصد اُدہر بدیدۂ پرنم اُلٹ گیا
دل یہ جسکے لئے پہلو میں نہاں رہتا ہے — یوں سنا ہے کہ اُسے بھی خفقان رہتا ہے

ناظرین گرچہ آگے بھی اس بحث کے سننے کو تیار رہیں مگر مختصر طور پر اک وقتی فیصلہ اسکا کردیں کہ اگر بقول آزاد۔ مومن وہابی۔ یا بقول دیگران اگر مومن پٹھان ہوتے تو

اُنکی شادی خواجہ درد کے گھرانے میں اُنکی نواسی سے کیا ہو سکتی تھی۔ معاذ اللہ یہ وہ عہد تھا اور اُسوقت کی خواجہ زادگی تھی کہ اگر انکو سلطنت بھی دے دی جاتی تو برادری کے باہر لڑکیوں کو جانے نہ دیتے۔ بلکہ ایسی صدہا نظیریں موجود ہیں کہ بادشاہوں نے اپنے گھر کی لڑکیاں محض فخر شرافت کیلئے اُنکے گھرانوں میں بیاہی ہیں۔ مختصر یہ کہ میں نے جو کچھہ اس تاریخ کے اندر لکھا ہے بے فرق صحیح ہے اور یوں اعتراض کرنے کو زبان خلق میرے قابو میں نہیں مگر ہ دریائے اشک چشم سے جس آن بہہ گیا کوشش کھینچ کر عرش کا ایوان ہلگیا

مومن کا تعشق اور شاعری کی برکت

دن بھی دراز رات بھی کیوں ہے فراق یار میں

کا ہے سے فرق آگیا گردش روزگار میں

جناب خانصاحب گستاخی معاف۔ فرق ورق خاک نہیں آیا ہے آپ مولوی آدمی ہیں آپ کیا جانیں کہ عشق کیا بلا ہے اور کیا کیا آفتیں یہ کمبخت ڈھاتا ہے آپکو خود اپنی خبر نہیں کہ عشق کا جادو آپ پہ چل گیا ہے آپ بلاؤں میں گھر گئے ہیں۔ آفتوں میں پھنس گئے ہیں اور محض اسی سبب سے آپ کے کاٹے نہ دن کٹتا ہے نہ رات کٹتی ہے اور گھر سے نکلتے اور کوچہ و بازار کے طرف جاتے۔ اور شاعری میں رات دن غرق رہتے تب سمجھیگا کہ گردش روزگار پر کسی اور کا نہیں بلکہ آپ کے ہی محبت کا اثر پڑگیا ہے یوں تو آپ ازل سے عشق کے بندے ہیں مگر خدا بھلا کرے صاحب جی کا جن کی محبت اسیر بھی بالاتر نظر آتی ہے یعنی ؎

ایکے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے

دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

ناظرین گلشن بیخار مولفہ نواب مصطفٰے خان شیفتہ ملاحظہ فرمائیں۔ گو واقعات اسمیں بالتفصیل تو نہیں مگر مختصراً کچھ ہیں۔ اور ایک شاگرد ادب کو مد نظر رکھ کے جو لکھ سکتا ہے، وہ لکھا ہے ـــ

صاحب معروف بہ صاحب جی سنام امتہ الفاطمہ بیگم بتقریب بدا وا با مومن خان کارش افتاد ماجرے چند کار بادر دو وابود مثنوی عمیق نام کہ از خان مغفرے الیہ است شرح نسخہ و حسن و جمال ہماں موزوں قداست۔

اب حضرت خان موصوف اپنی آن بان سے جسکی تصویر اوپر دکھائی جا چکی ہے دلی کے ایک کوچہ سے گذرتے ہیں اور وہ اپنے کوٹھے سے انکو دیکھ کے کہتی ہیں کہ ع

کلیجہ تھام لو کھڑکی کا پردہ ہم اٹھاتے ہیں ۔ مومن کی نگاہ اٹھتی ہے اور وہ اپنی نرگسی آنکھوں کے جادو سے انکو مسخر کر لیتی ہیں ۔ خانصاحب کوچہ عشق سے ناآشنا ہیں ہکا بکا ہو کے کہتے ہیں کہ ؎

انگڑائی لیکے اسنے مجھپر خمار ڈالا کافر کی اس ادا نے بس مجکو مار ڈالا

وہ عیار اسکو سنتی اور عیاری سے چپ لگا جاتی ہے۔ خانصاحب اپنے کلیجے پر اک داغ لئے ہوئے گھر پلٹے ہیں چونکہ غایت مہذب ہیں چپ لگ گئی ہوگا و تکیہ سے لگے ہوئے سوچ رہے ہیں کہ یہ ہوا کیا۔ کوئی راہ اس سے ملنے کی نکالنی چاہیئے۔ اور کسیکو ہمراز بنانا چاہیئے یہ بھی انکے دلمیں کھٹکا ہے کہ عجب نہیں یہ وہ بلاے بے درماں ہو جو جبہ دن آگے اپنے درماں کو میرے یہاں ڈولی میں آئی تھی کچھ ہی روز کے بعد خط جواب دیتا ہے۔ اور زبردستی دل کھینچے ہوتے پھر اسی کوچہ میں لے جاتا ہے۔ وہ پھر کھڑی ہوئی محوِ نظارہ نظر آتی ہے اور انکو دیکھ کے کہتی ہے کہ آہ ؎

بڑا اندیشہ ہے دیکھیں کدھر فرقت میں جاتے ہیں خدا بھلے بلاتا ہے کہ وہ بھلے بلاتے ہیں

خانصاحب ہوش میں اب نہیں ہیں قریب تھا کہ گر پڑیں۔ اک شخص نے ہاتھ تھام لیا اور انکو اک طرف لے چلا۔ ادہر دوسروں کو سنا کے وہ یہ کہتی ہے کہ ؎

ہوگئی دوری نہ کی الفت میں کیا حالت ابھی مومن وحشی کو دیکھا اسطرف سے جاتے تھا

مومن ابھی کچھ زیادہ دور نہیں گئے ہیں یہ آواز بھی اُنکے کانوں میں آگئی۔ اب جو گھر پلٹ کے آتے ہیں تو یہاں آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتے اور کہتے ہیں۔ لے واہ میں تو اچھا خاصہ ہوں۔ کوئی آثار ہم میں وحشیوں کے سے نہیں۔ پھر اُسنے مجھے وحشی کیوں کہا اب اسکا جواب کون دے۔ غرض یہی قصے پیش ہیں اور تنہائی میں دل سے راز و نیاز کی باتیں ہوا کرتی ہیں کہ ایک شریف صورت آدمی (اور وہی آدمی جسنے ابھی ابھی اُنکو گرنے سے سنبھالا تھا) آتا ہے اور بڑی متانت سے سلام کرکے دست بستہ عرض کرتا ہے کہ حکیم جی اک مریضہ یہاں لانے کے قابل نہیں ذرا چلکر اُس کو دیکھ لیں حکیم صاحب کو کیا خبر کہ یہ وہی مریضہ ہے جنہوں نے مجکو بیمار کر رکھا ہے۔ یہ بیچارے تشریف لے جاتے ہیں جب یہ اسکے ساتھ کوٹھے پر پہونچتے ہیں تو پہلے یہ غور کرتے ہیں کہ یہ ہم کہاں آتے ہیں۔ ابھی یہ سلسلہ خیال ناتمام سا ہے کہ نبض دیکھنے کی نوبت آتی ہے۔ نبض میں شوخی شرارت کے سوا کسی مرض کا پتہ نہیں چلتا۔ اب یہ سمجھتے ہیں کہ ہو نہو یہ اُسی عیار کی نبض ہے ادہر اسکو پاناتھا کہ دل ہی دلکو راہ ہوتی ہے وہ جھٹ ہاتھ جھٹک کے کھینچ لیتی ہے۔ اور وہ آدمی جو انکو لے گیا تھا غائب ہو جاتا ہے اب انمیں اور صاحب جی میں جو باتیں ہوتی ہیں اس کو وہ مثنوی عشق میں یوں لکھتے ہیں کہ ؎

اس غزل سے اُسے آگا کیا — ہاتھ کو ہاتھ جھٹک کھینچ لیا
ہے یہ بیچارہ تو آپ ہی بیمار — زرد ہے رخ سے عیاں ہے آزار

وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو اُدھر کا آوازہ ہے۔ ادہر مومن کہتے ہیں کہ ؎

کیا لگا دست دلآرام سے ہاتھ — دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

غرض ساری کی ساری مثنوی ایسی آب و رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اسکا ایک ایک شعر اہل محبت کو عالم محویت و تحیّر میں ڈال دیتا ہے اب حکیم جی کو

یہ حکم دیا گیا کہ روزانہ آ کے نبض دیکھ جایا کرو۔ چنانچہ سرکار میں یہ سلام کو روزانہ جاتے تھے۔ ابھی چند ہی دن سلسلہ آنے جانے کا رہا تھا کہ بے تکلفی ہو گئی اور اب تو ۔۔

یہاں تھا بیٹھنا مشکل وہاں ہے اٹھنا مشکل
کہ پاؤں کے انگوٹھے سے مراد اُن دباتے ہیں

یعنی صاحب جی نے پردہ اُٹھا دیا مگر ساتھ ہی ساتھ اُسکے مومن پر اُنکا رعب حسن پڑا ہوا تھا دس سوال اُدھر سے ہوتے تھے تو دبی زبان سے یہ ایک آدھ کا جواب دے دیتے تھے۔ مثنوی کا ہر شعر تو موقع موقع سے لانا طوالت ہے مگر مومن ایک شعر میں جو عشق مجازی کے جذبات کی جو تصویر کھینچتے ہیں اسکو دیکھ لو یعنی ۔۔

کہا چاہا کچھ بات کہوں کہہ نہ سکا
چاہا خاموش رہوں رہ نہ سکا

اللہ اللہ کیا کشمکش ہے اور کیا دم گھٹنے کی جگہ ہے یعنی چاہا کہ اظہار حال کروں مگر نہ کر سکا پھر یہ چاہا کہ چپ رہوں مگر چپ بھی رہا نہ گیا۔ اب عشق کے تھیٹر کا وہ پردہ اُٹھتا ہے جسمیں عاشق و معشوق آمنے سامنے بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور صرف ایک دوسرے کو نگاہ یاس سے دیکھ کے رو رہا ہے۔ مومن۔

کیا نئے ڈھب سے ملاقات ہوئی
کہ نہ کچھ بولی نہ کچھ بات ہوئی

مل کے حسرت زدگان بیکس
دور بیٹھے ہوئے روتے ہیں بس

کیا سلیقہ اور ادب آموزی عشق کی ہے۔ کہ ملکے بیٹھے ہوتے ہیں اور ذرا دور دور بھی ہیں۔ آج وہ حضرات جو میر حسن مرحوم کی مثنوی کے انداز پر مرتے ہیں دیکھ لیں کہ ہم کا۔ دنیا کیسے شام نہ کرو۔ کیا ان شعروں میں نیچرل جذبات نہیں ہیں؟ اب رونا تھمتا ہے لب پر آہ آ جاتی ہے یعنی ۔۔

خوں فشاں لب پہ وہ آہیں باہم
حسرت آلود نگاہیں باہم

تو اب اس طلسم کا وہ دردناک پردہ اٹھتا ہے جسمیں تمہیں اک عالم یاس کے

سوا یہ بھی لطرہین آئیگا یعنی اب صاحب جی نے ارادہ کرلیا ہو کہ مومن کو اُمید موہوم پر کیوں رکھئے صاف جواب دے دیجئے اور کہ دیجئے کہ افشا تے راز ہو گیا اب میرے اقربا مجھے دلی سے دوسری جگہ لے جانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ سمجھا کے فرماتی ہیں کہ مومن خان ۔

خیر رہنا ہوا اب تک اپنا   اب وطن تم کو مبارک اپنا
تم رہو خوش کسی جاناں کے ہتھا   ہم چلے حسرت و ارماں کیتھا
کام دل رنج و بلا کو سونپا   تم کو لو۔ ہم نے خدا کو سونپا

اب وقت نہین کہ زیادہ گفتگو کروں۔ اسی عرصہ میں کسی کے پاؤں کی آہٹ ملتی ہے اور شاید یہ وہی شخص ہو جو مومن کو ایک روز بلانے گیا تھا۔ غرض اک ہلچل سی دل میں پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ۔

کہ کے یہ اُٹھ گئی جی کھوتی ہوئی   ہچکیاں لیتی ہوئی روتی ہوئی

اُدھر صاحب جی کا ہٹنا تھا کہ مومن بھی روتے ہوئے گھر چلے آتے ہیں۔ اور تھوڑی دیر بعد اُنکو اپنے علم نجوم سے پتہ لگتا ہے کہ وہ دلی سے روانہ ہو گئیں اب کدھر گئیں کیا ہو تمں اس راز کو مقدر کھلنے نہیں دیتا۔ دل یہ تقاضہ کر رہا ہو کہ بی بی لڑکوں کو چھوڑ اور گھر سے نکل ننگ و ناموس کا غم نہ کر زمانہ جو چاہو کہے ۔
بندہ عشق شوی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

چنانچہ خانصاحب نے شہر و بیابان کی خاک بھی چھانی اور ناکام ہو کے واپس بھی ہو گئے یہاں تک تو مثنوی سے پتہ چلتا ہے مگر یہیں پر دو سوال بھی پیدا ہوتے ہیں سا صاحب جی اگر دہلی واپس نہوئیں تو مومن نے اُنکی غزلوں پر اصلاح کب دی جسکا ذکر شیفتہ نے کیا ہو ۲ اگر اُنکا انتقال کرنا تسلیم نہیں کیا جاتا تو کلیات مومن

ہیں یہ نوحے کیسے ہیں۔ اسلئے کہ مومن کی بی بی کا انتقال مومن کے بہت بعد ہوا
اب یہ کہ مومن کسی اور پر عاشق ہوئے اور اسکی موت کے متعلق یہ نوحے ہیں یہ
محض تطویل لاطایل ہے۔ عشق ہمیشہ آدمی کو ایک کا ہوا ہے اور ہوتا آیا ہے اسلئے گو حجیۂ
مثنوی سے یں اسکا ثبوت نہیں دلیسکتا مگر جیسا کہ سنا گیا۔ قرین قیاس ہے کہ
صاحب جی دلّی واپس آئیں اور یہیں اُنکا انتقال ہوا۔ بہر حال جو کچھ بھی ہوا اس
نقصہ نے میرے دیرینہ زخم کو تازہ کر دیا ؎

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیمکش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

میں خود اس زخم کی تکلیف سے آشنا ہوں۔ اور ضمیمہ کلیات عرش غیر مطبوعہ
سے اُسکا پتہ چلیگا ؎

اے عرش مجکو عشق نے بخشا یہ مرتبہ دیکھو ہے نظم غیر میں ایسا اثر کہاں

مومن کی استغنائی

انکی طبیعت نہایت غیور اور بے پرواواقع ہوئی تھی۔ بعد امرائے روزگار نے
چاہا کہ یہ درباری پابندی اختیار کریں مگر اور انکا دربار کیا جب انہوں نے
بادشاہ وقت کی مصاحبت اور پابندی پسند نہ کی۔ حالانکہ ذوق تو ذوق غالب
سا آزاد منش بھی اس معاملہ میں معذور رہتا۔

مومن کو والئے رامپور۔ والئے ٹونک۔ والئے بھوپال۔ والئے جہانگیر آباد وغیرہ نے اپنے
دوستانہ مراسم کے جال میں بہت پھنسانا چاہا مہاراجہ کپورتھلہ نے۔ ساڑھے تین سو روپیہ
ماہوار پر طلب کیا مگر وہاں بھی نہ گئے زاد راہ تک واپس کر کے یہ صاف جواب لکھدیا
کہ جس دربار کا ایک ادنٰے گویا ساڑھے تین سو روپیہ پاتا ہو وہاں میں اُسی تنخواہ
میں نہیں آسکتا۔ سر ٹامسن لفٹننٹ گورنر پنجاب نے سو روپیہ مہینہ مقرر کئے صیغہ تعلیم

میں اُنکو دہلی سے ساتھ لے جانا چاہا مگر اُنکو بھی جواب دیا کہ دلّی ابھی اتنی سستی نہیں کہ اسکو سو روپیہ میں مومن بیچ ڈالے۔ بقول میر

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب | رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُسکو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا | ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

غرض یہی وہ اسباب ہیں کہ مومن اور شعرائے معروف کی طرح عالم میں مشہور نہ ہو سکے ابھی تاریخ کے صفحات موجود ہیں دیکھ لو جس نے مقبولیت اور شہرت عام پائی ہے امرا کی مصاحبت کے بدولت پائی ہے۔ صرف اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے والوں میں شمع کی طرح اگر کوئی ہے تو وہ مومن یا چند اور حضرات ورنہ میر۔ سودا۔ سوز۔ میر حسن۔ سید انشا۔ میر انیس۔ مرزا دبیر۔ اسیر۔ ذوق۔ ناسخ۔ آتش۔ خلیق۔ جرأت۔ غالب۔ امیر۔ جلال۔ داغ۔ تسلیم۔ امانت وغیرہ وغیرہ سبھوں کو کم و بیش درباروں کی پابندی ضرور رہی ہے۔ اور سب نے امرا کی حسنِ سرائی میں بسر کی ہے۔ اب جو حضرات کہ مومن کی سی آزاد طبیعت لائے تھے اُنکا انجام صرف یہ ہوا کہ اپنے کمالات کے برابر بھی شہرت نہ پا سکے اسکی نظیر میں بھی چند نام پیش کئے دیتا ہوں۔ مظہر جانجاناں۔ آبرو۔ شاہ دیرو میر تسلیم۔ شاہ حاتم۔ مولانا شمشاد۔ امید مرحوم۔ خورشید۔ خواجہ میر درد وغیرہ وغیرہ۔ مومن کے قصیدوں کی طرف نظر ڈالو تو عمر بھر میں دو قصائد امرا کی طرف لکھ کے منسوب کئے ہیں ایک راجہ اجیت سنگھ والئے پٹیالہ کے نام پر ہے جنھوں نے رستہ سے مومن کو بلوا کے قدر دانی کی۔ اور ہاتھی کے عطیہ کے ساتھ رخصت کیا۔ مومن نے ہاتھی کے انعام کا بار اپنے سر لینا نہ چاہا اور یہ کہہ کے ٹالا کہ حضور میں غریب آدمی ہوں ہاتھی کو کہاں سے کھلاؤنگا۔ راجہ صاحب نے ایک نہ سُنی سو روپیہ بھی دئے کہ لو یہ ہاتھی کھائیگا۔ غرض مجبوراً منظور کرنا پڑا۔

اور بہ اقتضائے تہذیب انعام کے بعد اُنکو محض اس خیال سے قصیدہ پیش کرنا پڑیگا کہ راجہ دلمیں بھی کہیگا کہ آتے دن کے قصیدے پر ذوق کو دربار شاہی سے ایک ٹوٹو تک کبھی نہ ملا[1] اور میں نے بے طلب ہاتھی انعام میں دیا تو مومن نے ایک رباعی تک میری شان میں نہ لکھی۔

دوسرا قصیدہ نواب وزیر خان والیئے ٹونک کے نام کا ہے۔ جو دوستانہ پکڑ کے اپنے یہاں لے گئے تھے اور جنہوں نے بڑا تپاک کیا مجبوراً اُس شکریہ میں قصیدہ لکھا۔

مختصر یہ ہے کہ اگر مومن اپنے معاصرین ہم عہد کے راستے کو اختیار کرتے تو آج اُن کا دیوان مختلف ولایتوں میں زر و جواہر سے تولا گیا ہوتا۔ مگر کوئی کیسکی طبیعت اور دل کے اطمینان کو کیا کرے۔

تلمذ

کہا جاتا ہے کہ ابتدائی چند غزلیں شاہ نصیر مرحوم کو بنظر اصلاح دکھائی تھیں پھر وہ سلسلہ کچھ سمجھکے بند کر دیا۔ قرینہ غالب ہے کہ اپنے کو شاہ نصیر کے رنگ سے بہت دُور پایا۔ اور دیکھا کہ ہونے کو تو وہ اُستاد کیا اُستادگر ہیں اور سنگلاخ زمینوں کے بادشاہ ہیں مگر آہ آہ اور واہ واہ میں فرق ہے۔ ذیل کے چند شعروں ہی سے اسکا فیصلہ کیے دیتا ہوں دُور کیوں جاؤں۔

نصیر

سنگ وحشت نے رو دیوانہ فتادہ کو دیکھ ہاتھ ملتی ہے پتھورا کے محل کی کہنی

---

[1] حاشیہ: آزاد کی تو نہ پوچھیے۔ وہ تو صفحہ ۳۴۴ میں جہاں ذوق کو مومن کی دیکھا دیکھی نجوم علم موسیقی اور طب وغیرہ کا بھی ماہر لکھا ہے صفحہ ۴۴۴ میں یہ بھی لکھ گئے کہ صحت یابی کے قصیدہ کے صلہ میں بادشاہ نے ذوق کو خطاب خاقانی ہند عطا کیا اور ایک ہاتھی مع حوضہ نقرئی دیا۔ شاید دیا ہوگا۔ اس کا کہیں اور ذکر نہیں سنا پھر میر کا یہ مصرعہ کہ خانہ خراب تو مسجدیں کتنی ہیں کیا فائدہ تعمیر سے

خیالِ زلفِ دوتا میں نصیر پیٹا کر | گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

مومن سے

سرگرمِ مدحِ غیر دمِ شعلہ زن سے ہے | دوزخ کو کیا جلن ہے دل کی جلن سے ہے

مرا خون کیا بارِ گردن ہوا | کہ پیچیں وہ دست وگردن سے ہے

ببین تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا۔ جوڑا استاد شاگرد کا ایسا تو ہو جیسا کہ

منیر شکوہ آبادی اور میر علی اوسط رشک لکھنوی کا ہے۔

رشک سے ہونگے مرغانِ فلک بے واز تک شکار | جنبشِ موجِ ہوا زنجیرِ پا ہو جائیگی

بھیک مانگے گا ہر اک دریا نہ ہوگے تم اگر | کشتیِ ملاح کچکولِ گدا ہو جائیگی

منیر سے

شادی کروں عروسِ مضامیں نور سے | نکلے برات کوچۂ بین السطور سے

اتنا گیا میں جوشِ جنوں کے وفور سے | پتا جہاں فلک نظر آتا ہو دور سے

بہر حال ایک ہی دو غزل کی اصلاح تھی مگر نصیر مومن کے استاد تھے۔ اور عمر بھر یہ انکو ادب کے ساتھ یاد کرتے رہے۔ چنانچہ میں نے سلسلہ شاعری میں بھی اسی کو قایم رکھا ہے

ہو نہ بیتابِ غمِ ہجر بتانمیں مومن | دیکھ دلو دنیں بس لب فضلِ خدا ہوتا ہے

معاصرین

میر صاحب زمانہ نازک ہے | دونوں ہاتھوں سنبھالیے پگڑی

یوں تو اسوقت بہتیرے اساتذہ سلف نیز ذوق بھی موجود تھے۔ مگر کہنے والے یہی کہتے رہے کہ وہ مشاعرہ کیا جسمیں غالب و مومن نہوں۔ ہر چند مومن کا کلام غالب سے بدرجہا سخت تھا مگر شیدایان مشکل پسندی صرف غالب ہی کو مومن کا شریکِ غالب جانتے تھے۔ مرزا صاحب تو امر اسکے کہنے سننے سے شراب میں گلاب ڈال بھی دیتے تھے مگر مومن تو مٹے دو آتشہ میں پانی ملانا بھی گناہ جانتے تھے

مرزا بھی کہ ادا شناس تھے اُنکی نازک خیالی کو پسند فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ
بیشک رنگین بیانوں کو سادگی زیبا نہیں ہے

زندہ وہی ہیں جو کہ ہیں تم پر مرے ہوئے   باقی جو ہیں سو قبر میں مردے گڑے ہوئے

غرض ذوق تو فیضانِ شوق و نصیر سے لکھنو کے عطر مجموعہ بن گئے تھے۔ مگر مومن نے ازل سے جس راستے کو پکڑا تھا اُسی پر رہے اور غالب ہمیشہ اُنکے ہمسفر رہے۔ اور دونوں میں کچھ ایسی دانت کاٹی روٹی تھی کہ ہمعصروں کی طرح کبھی آپس میں نہ جھگڑے۔ سللہ غالب سے جب کسی نے پوچھا کہ دلّی میں آج شاعر کون ہے تو یہی کہا کہ میں اور مومن۔ مومن کے کسی شعر تک جب کوئی نہ پہونچ سکا تو انہوں نے یہی کہا کہ اس کا مطلب غالب سے پوچھو۔ چنانچہ بزم مومن و غالب میں کسی نے ذوق کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ ان دونوں سے کھٹکتے رہے۔ اگر کسی مشاعرہ عام میں شرکت او یکجائی کی نوبت بھی آتی تو وہ ہمیشہ محجوب سے نظر آتے تھے۔ ہاں قلعہ کی دیوار کے اندر تقیم شہر سے بھی دو چار ہاتھ زیادہ پھاند لیتے تھے۔

سفر۔ خانصاحب کا کوئی سفر تحصیل زر کے لیئے نہیں ہوا۔ بلکہ وہی جذباتِ عشق جب شدت پر تھے اور محرومیوں سے دم گھبرا گیا تھا تو گھر چھوڑ کے چند روز کیلئے نکلے تھے۔ یہاں تک کے رام پور۔ سہسوان۔ بدایوں۔ جہانگیر آباد۔ ٹونک۔ سہارنپور تک گئے۔ مگر جی نہ بہلا تو پیر نگ واپس ہو گئے۔ کسی کسی سفر کا ذکر کلیات میں

سللہ اس ربط کو انکے یادگاروں نے بھی قایم رکھا۔ چند سال ہوئے کہ حسرت موہانی نے علیگڈھ میں جو مشاعرہ کیا تھا اسمیں غالب کے نام لیوا میر مہدی مجروح اور مومن کی یادگاروں میں تسلیم شریک کئے گئے تھے ان دونوں میں کچھ ایسی محبت دیکھی گئی جو اس زمانہ کے اپنے بھائیوں میں بھی نظر نہیں آتی۔ تسلیم نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ

غنیمت جان اے تسلیم دو اک ہم سے بچے کھچوں کو   کہ یہ لطفِ سخن حسنِ بیاں اپنی زبان تک ہے

بھی کیا ہے ؎

دلّی سے رام پور سے لایا جنونِ عشق — ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

سہسوان کا سفر صاحب جی کی تلاش میں تھا جسکا ثبوت دوسرے شعر سے ہوتا ہے

چھوڑ دلّی کو سہسوان آیا — ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں
مجھے پہونچا دو میر صاحب تک — کہ غلامِ گریز پا ہوں میں

بدایوں میں مجھے جوشِ جنوں لایا ہے دلّی سے — یہ کیونکر چارۂ پندِ خردمنداں ہوش آیا

ہاں آج یہ بتانا دشوار ہے کہ ان شہروں میں کس کس کے یہاں ٹھہرے پھر بھی بعض مقامات کا پتہ چلا ہے۔ جو درج کرتا ہوں۔ رامپور میں نواب احمد سعید خاں کی مسند نشینی کے موقع پر بلائے گئے تھے۔ جہانگیر آباد میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے یہاں کہ ہمراز بھی تھے اکثر گئے۔ سہسوان میں اپنے ہمراز دوست حکیم مظہر علی کے یہاں کہ وہاں کے رئیس تھے تشریف لے گئے تھے۔ ان حکیم صاحب کے صاحبزادے حکیم منظر علی صاحب لشکرِ گوالیار میں وکیل ہیں وہ فرماتے ہیں کہ خانصاحب نے چند دن کے قیام میں اک تصنیف بھی کی تھی۔ چنانچہ اسکا ذکر آگے آئے گا بقیہ راز سے وہ بیخبر ہیں۔

بیعت اور عقاید

کلکتہ کا وہ عظیم الشان مشاعرہ مجکو عمر بھر نہ بھولیگا جسکو میری خاطر سے چند سال ہوئے خان بہادر شمس العلما مولانا محمد یوسف صاحب رنجور عظیم آبادی ہیڈ چیف مولوی بورڈ اوف دی اکزمنرس نے منعقد کیا تھا اسمیں تقریباً چھ سو صرف شعرا تھے اور پچاسوں کرسیاں یورپین اور ہندوستانی بڑی بڑی تعلیمی جماعت میں اک امتیازی کرسی۔ ڈاکٹر آیت اللہ بسمل عظیم آبادی ایم۔ بی۔ سی۔ ایم کی بھی تھی۔

جو وضع اور صورت سے بے فرق یورپین[سلطہ] معلوم ہوتے تھے۔ کوئی نوے ۹۰ برس کی عمر ہوگی آپکے والد اور مومن کی دوستی تھی اُنکے ساتھ زمانہ طفولیت میں آپنے مومن کو دیکھا تھا آپکے والد بھی مومن کی طرح حضرت علامہ سید احمد بریلوی رح کے مرید تھے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ میں نے مومن کی زبان سے یہ شعر سنا ہے جو حضرت صاحب کے طرف منسوب ہے۔ مولانا سید احمد بریلوی حضرت صاحب کے نام سے مشہور تھے مومن اپنے پیر کے طرف رخ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ؎

زمانہ مہدی موعود کا پایا اگر مومن　　　تو سب سے پہلے کہیو تو سلام پاک حضرت کا

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ الزام وہابیت مومن پر غلط ہے اب یہ کہ اُن پر یہ آوازہ کیوں ہوا اُسکا سبب وہ یہ فرماتے ہیں کہ مومن کے قلم نے خرقہ پوشان بے بہرہ کیطرف اشارہ کرتے ہوئے یہ رباعیاں لکھیں تو اُسوقت کے مشایخ جو اپنے مریدوں سے سجدہ تک حلال ٹھہرائے ہوئے تھے بگڑ گئے اور دیکھا کہ یہ شخص ڈھولک ستار اور قوالی کو بند کرا دیگا۔ اور مُریدآباد سے اک ٹکا بھی نہ ملیگا۔ اس لئے بہتر ہے کہ لوگوں کو اسکے طرف سے برگشتہ کردو ورنہ مومن اور اُنکا سارا خاندان حنفی مسلک تھا خدائی کا دعوےٰ کرنے والے وہ رباعیاں سن لیں۔

مومن ہے اگرچہ سب اُسی کا یہ ظہور　　　توحید وجودی کا نہ کرنا مذکور

یعنی کہ بنائے ہیں خدا نے بندے　　　بندے کو خدا بنائے کس کا مقدور

سلطہ برسوں ولایت میں رہتے پر بھی مذاق آپکا اسقدر سلیم ہو سہ شنا ور رابطہ الفت کے ہم ہیں کہ ہمارے بحر کا ساحل نہیں ہے کہ اسی مشاعرہ میں خاکسار نے حضور نواب مرشد آباد کو بھی دیکھا تھا جو بڑے زبردست محقق تھے یہ شعر اُنکا خاکسار کے طرف منسوب ہے۔ سہ نہ آج عرش پہ کیوں ہو دماغ کلکتہ کہ جناب حق آگیا ہے یہاں ہیں آتے ہوئے کچھ ذکر اس مشاعرہ کا انگریزی اردو اخبارات میں بھی ہو چکا ہے ناظرین دیکھ لیں۔۔

مومن لازم ہے وضع مرغوب بنے　　　　جو رنگ ہو آدمی خوش اسلوب بنے

کیا خرقہ و عمامہ سے اللہ اللہ　　　　جب شکل بگڑ گئی تو تم خوب بنے

وہابی نہ ہونے کے ثبوت میں اک تخمیس بھی ہے۔ یعنی جن حضرات کو وہابیت کا غلو ہے وہ نعوذ باللہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان کثرت ریاضت و عبادت سے نبی ہو سکتا ہے۔ نبی آخر الزمان یعنی حیہ۔ قدسی کے اشعار پر مصرعے ہیں ؎

ہوں تو عاشق مگر اطلاق یہ ہے بے ادبی　　　　ہیں غلام اور وہ صاحب ہیں امت وہ نبی

یا نبی یک نگہہ لطف بہ امی و ابی　　　　مرحبا سید مکی مدنی العربی

دل و جاں بست فدائے چہ عجب خوش لقبی

اسکے علاوہ صحابہ کرام کی مدح میں قصاید موجود ہیں۔ اب اس پر بھی وہ وہابی سمجھے جائیں تو اور بات ہے سید احمد صاحب نامی ولی اللہ سے گذرے ہیں کلکتہ میں آپ سے یہ کرامت ظاہر ہوئی کہ یک حلقہ میں تین سو مریدوں کو ایک نالہ اللہ ہے میں علم ظاہری و باطنی کے منازل طے کرا کے واصل حق کر دیا۔ اسکے شاہد حضرت مولانا قاری نور محمد صاحب چشتی ہیں جو چلی قبر دہلے کے رہنے والے تھے۔ سید صاحب کا اک ادنے رتبہ یہ تھا کہ جب یہ گھوڑے پر سوار رہتے تھے تو حضرت علامہ مولانا محمد اسمٰعیل رح سر پہ گھانس کا ٹوکرا لیکے انکے پیچھے پیچھے ہوتے تھے۔ کیا دنیا کے پردے میں کسی وہابی کو یہ شرف حاصل ہوا۔ مومن کے پیر کا مرتبہ آنزادکیا جانیں۔ بڑے بڑے لوگ اور بالخصوص علما انکے مرید تھے جنمیں مولانا محمد اسمٰعیل شہید بھی تھے۔ مومن خود کوئی جاہل آدمی نہ تھے کہ سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور اک وہابی کے وسیلہ کو سبب نجات قرار دیا ؎

فلک۔ کیا چودھویں کا چاند تو مجکو دکھاتا ہے
ہم ایسے طشت میں اک مہ جبیں کا منہ دہلاتے ہیں

طرز غزل خوانی۔

چونکہ یہ علمِ موسیقی کے بھی ماہر تھے اُس پر عاشق مزاجی مزید برآں تھی یہ سبب تھا کہ مشاعروں میں غزلیں ترنم کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ آواز بہت دردناک تھی غزل پڑھنے کیوقت انگلیوں کی کنگھی زلفوں میں چلتی رہتی تھی۔ جب شعر کوئی گرم ہوتا تھا اور داد مناسب ملتی تھی تو حرکت انگلیوں کی بڑھ جاتی تھی اہلِ مشاعرہ وجد کرنے لگتے تھے۔ اور نرم دل رو پڑتے تھے۔ اسکی چشم دید تصدیق آزاد نے بھی کی ہے انہوں نے بھی نسیم دہلوی اور شہزادہ قیصر کے مشاعرہ میں اُنکو سنا تھا مختصر یہ کہ ترنم کیسا تھا مشاعروں میں پڑھنے کے یہ موجد گذرے جسکو اب بقول شمشاد مرحوم لوگوں نے یہانتک بگاڑ ڈالا کہ سازکے ساتھ کہیں کہیں مروج ہے اور بعض حضرات نے اپنے پاؤں میں گھنگرو باندہ کے ناچنا شروع کر دیا ہے اور ناک بھی جان صاحب بجنی گو کیطرح اُنگلی بھی رکھنے لگے ہیں۔ یہ زمانہ کی بدتری۔ غالب اس عذاب سے پاک تھے وہ خود اور اُنکے بعض نام لیوا تحت[سلہ] اللفظ کیطرح بہ آواز بلند پڑھتے تھی۔ اور آج بھی پڑھتے ہیں۔

[سلہ] اب اُس تحت اللفظ کیصورت ملاحظہ ہو کہ غالب کو تو بندے نے نہیں دیکھا ہاں اُنکے اک شاگرد شوخی رامپوری کو دیکھا اور سُنا تھا یہ گیا میں برابر آتے تھی۔ چنانچہ مطلب تو نہیں عرض کر سکتا مگر انکا ایک مطلع یاد ہے

شامیانہ جو مرے دل کی صفائی ہوتی	دہوپ چھن چھن کے مری قبر پہ آئی ہوتی

پڑھنے کا اُنکے یہ عالم تھا کہ بہادو نہیں یا دل کھچ رہا ہو۔ اپنی جگہ سے سات سات گز نکل جاتے تھے اور اپنے زانو پر اس زور سے ہاتھ مارتے تھی کہ لٹھے کا نیا پاجامہ پھٹ جاتا تھا۔ پاس کے لوگوں کو موقع پا کے دہولیں بھی جماتے تھے اور فخر کیا تھ یہ فرماتے تھی کہ استاد غالب کی تقلید کر رہا ہوں اُنکے نامی شاگرد منشی احمد علی عشرت گیاوی میرے دوست صادق الوداد تھے برادرانہ مراسم رکھتے تھو وہ البتہ کہتے بھی اچھا تھے اور پڑھتے بھی خوب تھے آواز انکی بہت بلند تھی منہ اندھیری رات میں مشاعرہ کے روز محلہ کا کوئی آدمی سو نہ سکتا تھا اُچھل کود نہ تھی ہاں شعر پڑھتے وقت جوش میں کھڑے ہو جاتے تھی۔ یہ سرِ مشاعرہ بھی شراب پیتے تھے اور کہتے تھی کہ مرزا غالب کا نام زندہ کر رہا ہوں چہرہ بدن۔ میانہ قد گورے آدمی۔ پچاس پچپن برس کی عمر میں مرے ہونگے اُنکی صورت کیطرح وہ ذو مشاعرہ بھی آنکھوں میں پھرتے ہیں جنمیں میں خود شریک تھا ایک طرح تھی سحر ہوتے نہیں اثر ہوتے نہیں۔ چنانچہ اس شعر کو مصرع اول میں نسیم کو مخاطب کرتے ہوئے منہ موڑ کے اظہارِ نفرت فرماتے ہوئے کہا کہ ؎

بقیہ مضمون صفحہ ۶۲ میں ملاحظہ ہو

تصانیف مومن

۱۔ کلیاتِ اردو۔ مع قصاید و مثنوی۔ و جمیع اقسامِ نظم مرتبہ آہی مرحوم یہ بے انتخاب مختلف مطبع میں نہایت غلط چھپا ہی اور مشکوک بھی ہی یہی وہ کلیات ہی جو مرض الموت میں جمع کیا گیا تھا اسکے پہلے مجموعہ دیوان نوشتہ میر حسین تسکین شاگردِ مومن جسکے حاشیہ پر خود خانِ والاصفات کی جابجا تحریریں ہیں مرتب پایا تھا مگر چونکہ تسکین مومن سے چند ماہ قبل مر گئے اسلئے یہ دیوان کہ انہیں کی تحویل میں تھا دورانِ علالت مومن میں نہ مل سکا مجبوراً دوستوں اور شاگردونکی کوشش سے کچھ غزلیں فراہم کی گئیں اور وہی بصورت کلیات مرتب ہوئیں۔

دیوان مذکور کے نسبت حضرت ناصر نواسہ مومن فرماتے ہیں کہ (وہ دیوان آپا میمونہ بیگم مرحومہ نے جو پوتی تسکین کی تھیں پیر عبد الصمد صاحب ساکن کوچہ پنڈت دہلی کو دے دیا تھا میں نے خود اسکو دیکھا اور بہت کوشش کی کہ وہ نسخہ یا کم سے کم اسکی نقل مل جائے مگر وہ کسیطرح راضی نہ ہوئے)

بقیہ مضمون صفحہ ۱۱۔ پہونچی نہ میری خاک بھی جب کوے یار تک "تو دو جا" تجھسے اے نسیم سحر بولتے نہیں۔ شعر پڑھتا تھا کہ اس ادا پر واہ واہ کی صدا سے مشاعرہ گونج اٹھا۔ مگر چونکہ نشہ غالب تھا اسلئے سلام کرتے تھے سرِ تسلیم سامنے کے اوگالدان پر پڑا ہوا ہی مختصر یہ کہ اگر یہ شخص شراب نہ پیتا تو آدمی تھا۔ دوسرے مشاعرہ کا حال سنو کہ ساری غزل پڑھ چکے تو نظر بچا کے مشاعرہ سے باہر نکل گئے اب پھر کمرے کے دروازہ سے داخل ہوتے ہوئے جھک جھک کے تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ؎

جس بزم میں شغلِ مے و مینا نہیں ہوتا — باہر ہی سے تسلیم بجا لاتا ہے عشرت

جب سے انکا انتقال ہوا میں نے مشاعرہ کی شرکت چھوڑ دی۔ حکیم نبولال بنارسی بھی ایک انکے کہنہ مشق نازک خیال استاد بھائی تھے مگر وہ سیدھے سادے آدمی ہوے میرے محترم کرم فرما تھے وہ بھی مر گئے بطور یادگار انکے دو شعر بھی لکھے جاتے ہیں ؎

ہوتی ہے عمر بھر کی صفائی رکے نہ ہاتھ — دم بھر تو اور حلق سے خنجر جدا نہ ہو
نازک دماغ یار ہے بگڑے گی بنکے بات — یارب شکستِ دل میں ہمارے صدا نہ ہو

افسوس ان لوگوں کا دیوان تیار ہے مگر کوئی چھپنے کی صورت نہیں۔ گیا ہیں ہمیں لوگوں کی صحبت سے دلی کا نام روشن تھا۔ اب ایک خدا کی ذات ہے اور میں ہوں ۔۔۔

ناصر صاحب فرماتے ہیں کہ اُسکے حاشیہ کی تطری جانچ کی تو مجکو قطعی الیقین ہوگیا کہ یہ مومن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہی کیونکہ میں نے اُنکی تحریر دیکھی ہی جسکا ذکر آگے آئیگا۔ خاکسار عرشؔ نے پیر عبدالصمد صاحب کو بہت کچھ لکھا کہ آپ مومن کی روح کو نیز اُنکے خیر طلبوں کو تکلیف نہ دیں گر انہوں نے ۲۸ ماہ صیام ۱۳۷۲ھ کو صاف جواب دیا کہ کیسا دیوان میرے پاس کوئی تصنیف ہی مومن کی نہیں ہی۔ چنانچہ میں نے اسی ملال کے سبب اُنسے دلی میں ملنا پسند نہ کیا۔ اب اصلی حال سُنئے کہ مومن کی حقیقی بہن کی لڑکی آسی سے منسوب تھیں اور میمونہ بیگم اُنہیں کی صاحبزادی کا نام ہی جنکی شادی سیف الدین مرحوم سے ہوئی تھی جو ماموں زاد بھائی پیر عبدالصمد صاحب کے تھے اور پیر عبدالصمد صاحب کالے صاحب کے گھرانے کے ہیں جنکی تاریخ مرگ مومن نے لکھی ہے۔ غرض جب یہ تعلقات مومن خاں صاحب کے گھرانے سے وابستہ ہوئے اور سید احمد صاحب امام مسجد جامع کی کچھ اندرونی تحریک ہوئی تو سالہا سال کے بعد یہ دیوان منتقل ہوتا ہوا پیر عبدالصمد صاحب تک پہونچ گیا۔ اب تو دانی و خدادانند کے سوا کیا فیصلہ کیا جا سکتا ہے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

میں کیسے کم تڑی کاوشوں کے بعد پتہ بتاتے جاتا ہوں۔ کوئی خدا کا بندہ ایسا پیدا ہو جائیگا جو گڑے ہوئے خزانہ کو اکھاڑ ہی لیگا۔ تذکرہ نویسوں نے اسی رشتہ کو سُن کے آسی کو مومن کا داماد لکھا ہی درحقیقت وہ اُنکی اُس بہن کے داماد تھے جن کو مومن بہت مانتے تھے معلوم ہوتا ہی کہ اسی سبب سے یہ دورانِ علالتِ مومن میں بھی موجود رہے اب بات اتنی ہی کہ جب تک کہ دیوان سامنے نہ آئے فیصلہ نہیں ہو سکتا ہی کہ اسمیں وہی غزلیں ہیں جو موجودہ کلیات میں ہیں یا کیا۔

دیوانِ فارسی

اسکو حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے ۵۷ء سے پہلے ترتیب دیکر مطبع سلطانی

دہلی میں چھپوایا تھا۔ اب کمیاب ہے۔ فقیر عرشی نے کچھ کلام اُن سے حاصل کیا ہے جو آگے درج کیا جائیگا۔ صاحبِ تذکرہ گُلِ رعنا کا میں بھی ہمخیال ہوں یعنی کلامِ فارسی بھی اپنے رنگ میں لاجواب ہے اور وجہ دلفریبیاں کہ مومن کے کلامِ اُردُو کے ساتھ مخصوص ہیں اسمیں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مومن کے انتقال کے تین سال بعد یہ کتاب چھپی۔ اس میں (۹ قصاید۔ ۱۵ غزلیات۔ ۱۷۱ رباعیات۔ ۸۵ قطعات ہیں)

۳۔ انشائے فارسی

یہ کتاب بھی مطبع سلطانی دہلی میں غدر سے پہلے چھپی مگر بجز پُرانے کتب خانوں کے کہیں پائی نہیں جاتی۔ اسکو بھی حکیم احسن اللہ خاں وزیر بہادر شاہ ظفر و عزیز مومن نے چھپوایا ہے۔

۴۔ جانِ عروض۔

جب نسیم دہلوی نے دہلی کو ترک کیا اور لکھنو آنے لگے تو اُستاد کی یہ قلمی کتاب بطور تبرک ساتھ لیتے آئے اور اسکو بڑی حفاظت سے اپنے تکیہ میں رکھتے تھے۔ اُستاد تسلیم نے بھی اسکو دیکھا تھا کہتے تھے۔ کہ کتاب عروض و قوافی میں نہایت مفید تھی مگر افسوس کہ نسیم کے سرمایہ کے ساتھ لُٹ گئی۔ بہر حال میں اسلئے اسکا پتہ دئے جاتا ہوں کہ شاید کبھی برآمد ہو جاتے۔ کیونکہ ابھی آزاد نے آبحیات میں دیوانِ میر حسن کے ناپید ہو جانے کو لکھا تھا۔ مگر تقریباً ڈیڑھ صدی کے بعد نظر افروز زمانہ ہے۔ اور علیگڈھ میں چھپا ہے۔ اور تعجب یہ کہ میر انیس اور میر نفیس تک کو اسکی خبر نہیں۔

۵۔ شرح سدیدی و نفیسی۔

جب خانصاحب حکیم مظہر علی مرحوم کے یہاں سہسوان میں مہمان تھے تو یہ انکی تحریک پر ان مشکل کتابوں کی شرح لکھی تھی۔ حکیم منظر علیصاحب وکیل جنکا ذکر کر چکا ہوں اُنکے پاس یہ کتابیں موجود ہیں اور مومن کے قلم کی لکھی ہوئی ہیں حضرتِ ناصر نے

ان کتابوں کو بھی دیکھا ہے مگر اسکا جواب کیا کہ ہم نہ دینگے ہائے ؎

صبر یارب مری وحشت کا پڑیگا کہ نہیں — چارہ فرما بھی کبھی قیدیِ زنداں ہونگے

میں جو آزاد کی عدم توجہی کو جا بجا رو رہا ہوں تو لوگ فرماتے ہونگے کہ اُنکی کیا خطا وہ کیا کرتے۔ میں کہتا ہوں کہ مومن کے قافلہ کے کوچ کرنے کے بعد بلکہ مجھسے پچاس سال آگے وہی ایک شخص اس* مذاق کے دہلی میں تھے اگر وہ چاہتے تو کھڑے کھڑے یہ سارا خزانہ زمین سے اگلوا لیتے۔ مگر اسکا جواب کیا کہ وہ تو مومن کو مٹانا چاہتے تھے۔ اب میں منزلوں دور کا رہنے والا۔ اس عہد میں کہ مذاق ان باتوں کا نہ رہا۔ شاعری خود اپنی صورت بدل رہی ہے کیا کروں۔ اور تنہا کس کس سے لڑوں۔

؁ خواصِ پان۔

یہ رسالہ پان کے خواص میں لکھا تھا۔ اسکے افعال اور خاصیت میں بڑی رنگیں بیانی صرف کی ہے آج بھی مومن کے ایک عزیز کے قبضے میں ہے اور وہ بزرگ بقدر دانی اسکو پاندان میں بند رکھتے ہیں اگر مانگو تو منہ لال کر دیں۔ اب کس کس کی شکایت کیجئے ؎

دو لوابر تیجو دو نوگیسو چار موذی ہیں ہم — ایک تو بچھو کا جوڑا ایک جوڑا سانپ کا

خاکسار عرش نے دلّی جا کے اس پاندان کو بھی چھانا مگر آفریں اس پردہ داری پر کہ مومن کی اس کتاب کا سُراغ نہ چلا۔ گویا ؎ ناسخ

؎ مسی آلودہ لب پر رنگِ پاں ہے — تماشہ ہے تہِ آتش دھواں ہے

کلام غیر مطبوعہ مومن

حکیم منور علی آشفتہ شاگرد رشید مومن۔ جو انور تجارہ کے رہنے والے اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے مصاحب تھے اونکے پوتے جناب حامد حسین صاحب بونڈری اوفیسر ریاست ویتا ضلع بنیلکھنڈ۔ میں ہیں۔ یہ از راہ اہلیت صراغ رسانی فرماتے ہیں کہ میرے جد بزرگوار کے نام مومن کے لکھے ہوئے چند خطوط

اور قریب سوڈیڑھ سو غزلیں کتب خانہ الور میں موجود ہیں۔ عنقریب وہاں سے لاکے قبل طبع اس تاریخ کے دونگا خدا توفیق عطا فرمائے مگر کچھ نہیں تو ڈیڑھ سو خطوط لکھہ چکا وہ روز وعدہ وفا کر رہے ہیں ہائے ؎

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے | واں یہ پہونچا کہ فرشتہ کا بھی مقدور نہ تھا

درستی مزار مومن کا اور اس کتاب کے بہم پہونچانے کا وعدہ تو ناصر صاحب نے بھی فرمایا ہوا ہے اسلئے اسکے جواب دہ وہ ہونگے۔ اگر اس کتاب کے چھپنے تک میں کامیاب ہوگیا تو خیر ورنہ کوئی اور بندۂ خدا اسکو کریگا۔ کسے کم ناظرین میری کاوشوں اور جگر خراشیوں کو یاد کرکے مجھے ایک سورۂ فاتحہ سے تو نہ محروم رکھینگے۔

انداز تحریر مومن۔

اب دنیا کے پردے میں اسکے دلکھ دیکھنے والے صرف مولانا ناصر ہیں اور وہ فرماتے ہیں کہ انکی تحریر خط شیفتہ سے ملتی ہوتی ہے۔ افسوس کہ لوگوں نے اسکے عکس تک کے دینے سے انکار کردیا۔ ورنہ اس کتاب میں ضرور درج کرتا ہائے ؎

دیتا دل مضطر کو تری کچھ تو نشانی | پر خط بھی ترے ہاتھ کا لکھنا نہیں آتا

طریقۂ اصلاح۔

ایک روز حکیم مومن خان کا دربار لگا ہوا تھا کہ انکے شاگرد میاں خیرالدین یاس جو عاشق مزاج بھی تھے عالم اضطراب میں آئے اور کہا کہ استاد ایک مطلع ہوا ہے اسپر اصلاح ہوجائے۔ مومن اداشناس تھے مسکرا کے فرماتے ہیں کہو۔ یاس عرض کرتے ہیں ؎

ہجر میں کیونکر بھروں ہر سو نہ گھبرایا ہُوا | وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہوا

مومن شعر کا روئے سخن پھیرتے ہوئے منہ پھیر کے فرماتے ہیں کہ یوں کہو ؎

اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہُوا | وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہُوا

انگاہ والے سمجھ سکتے ہیں کہ شعر کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ دلّی کے ایک کہنہ سال شخص راوی ہیں کہ

تسکین نے جب یہ مصرع کہا کہ ع کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی + تو شب بھر انکو مصرع اول کی تلاش رہی۔ آخر صبح کو خانصاحب کے پاس آئے۔ خانصاحب کے یہاں ایسے شعروں کے ڈہالنے کو سانچے پڑے رہتے تھے فوراً ارشاد ہوتا ہو کہ ؎

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے　　　کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

جب یہ شعر مشاعرہ میں پڑہا گیا تو بعض لوگوں نے کہدیا کہ یہ مومن خاں ہیں۔ چنانچہ آجتک گو کلیاتِ مومن میں نہیں مگر یہ شعر مومن کے نام سے مشہور ہے۔

شاگردانِ مومن اور اُنکا کلام

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ و حسرتی رئیسِ پلول و جہانگیر آباد

یہ اُردو اور فارسی میں حکیم مومن خانصاحب کے شاگرد تھے۔ بعد انتقالِ مومن کچھ فارسی کلام غالب مرحوم کو بھی دکھایا تھا۔ مگر اُردو میں خاتمہ مومن کے نام پر ہوا۔

یہ مومن کے بہترین شاگرد اور صحبت لوگوں میں تھے۔ جہاں مومن و غالب و صہبائی و آشفتہ وغیرہ جمع ہوتے تھے وہاں اُنکی بھی اک امتیازی جگہ تھی۔ عربی فارسی کے فاضل تھے طبیعت نکتہ سنج واقع ہوئی تھی۔ آگے شراب بھی پیتے تھے مگر ادہر توبہ کر لی تھی اور حج کعبہ بھی مشرف ہوتے تھے۔ غدر میں انکی ریاست آفاتِ آسمانی سے محفوظ رہی۔ انکا اُردو دیوان اور تذکرہ گلشنِ بیخار تو چھپ گیا ہے بقیہ اور سرمایہ جسمیں مومن کا بھی مال تھا لیٹ گیا۔ مذاق انکا نہایت سلیم تھا۔ شمس العلما حالی مرحوم کہ عرصہ تک انکی مصاحبت میں تھے بیان کرتے تھے کہ ایکروز انکی صحبت میں میر انیس کے مرثیہ کا ذکر آگیا وہ فرمانے لگے بولے وہ چار جلدوں کے مالک ہیں اور انکے کلام کی داد نہیں دی جاسکتی مگر یہ نہ بھی ہوتیں تو صرف انکا یہ مصرع حق مرثیہ گوئی کے ادا کرنے کو کافی ہے۔ اسمیں اسوقت کی تصویر کھینچی گئی ہے جب امام حسین علیہ السلام بے مونس و غمخوار میدانِ کربلا میں کھڑے تھے ع

آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے　　　الله الله عجب یاس او رسناٹا ہے

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ یہ فارسی میں صرف غالب کے شاگرد تھے مومن کے نہ تھے یہ ثبوت اسکے ایک غزل کے کچھ شعر تمہیں دکھاتا ہوں جسکے مقطعوں سے غالب و شیفتہ کا معاصرانہ انداز ظاہر ہوتا ہے اور یہ مومن کی حیات کی غزل ہے شیفتہ سے

درزد صلائے جلوہ و خلقے برشک سوخت
دستِ کرم کشادہ و ممنون نہ کردہ کس

زیں غم کہ ساغرِ مے گلرنگ نشکند
یادے حکایتِ دلِ پرخوں نہ کردہ کس

اے حسرتی مپرس ز غالب کہ از غزل
آن کار میکند کہ بافسوں نہ کردہ کس

نواب صاحب فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ مرزا غالب انکے مقطع کا جواب دیتے ہیں سے

غالب ز حسرتی چہ سرائی کہ در غزل
چوں اُو تلاشِ معنیٔ و مضموں نہ کردہ کس

انکی اردو شاعری کا مذاق کسقدر سلیم تھا اسکے ثبوت میں صرف ذیل ہی کا شعر کافی تھا مگر ناظرین کی خاطر سے چند شعر اور بھی لکھے دیتا ہوں۔

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زُہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کسکے گھر ملے

ولہٗ

اے مرگ آ کہ میری بھی رہ جائے آبرو
رکھا ہے اُس نے سوگ عدو کی وفات کا

دشمن کہیں گیا نہ ہو آنکھوں سے شیفتہ
اُسکی گلی میں آج نشانِ قدم نہیں

ذیل کے شعر کا جو انداز ہے وہ صرف مومن کی ذات سے وابستہ ہے اور بس سے

تنگ اتنا نہ کر اے شوقِ ہم آغوشی کہ وہ
ڈھونڈھتے ہیں چلے جانے کو بہانہ شبِ وصل

دیوان انکا دوبارہ علیگڈھ میں چھپ گیا ہے اہل ذوق اُسکو ملاحظہ فرمائیں۔

رئیس ابن رئیس نواب محمد اکبر خان۔ اکبر تخلص تعلقہ دار جہانگیر آباد ہلول یہ شیفتہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ کثر جہانگیر آباد اور زیادہ دھلی اور راولپنڈی میں رہا کرتے تھے۔ راولپنڈی میں انتقال بھی ہوا۔ دوران قیام دھلی میں شعر بھی کہا کرتے تھے

اور مومن سے اصلاح لیتے تھے۔ دیوان کا پتہ نہیں چلتا۔ ہاں تذکروں سے چند شعروں کا ہار تیار کرکے انکے مزار پُرانوار پر چڑھا دیتا ہوں اور ایک سورۂ فاتحہ پڑھ دینا سعادت جانتا ہوں۔ میرے خیال میں انکی شاعری کا پایہ شیفتہ سے زیادہ بلند ہوتا اگر ان کی حیات وفا کرتی۔ سرسید مرحوم بھی انکی سخن آرائیوں کے معترف ہیں کلام میں نازک خیالی اور مومن کا انداز بہت ہے۔

خانۂ غیر میں گر لگنے لگا جی تیرا
ہمکو بھی اور سے آتا ہے لگانا دلکا

قتل کر لاشۂ اکبر کو چھپایا گھر میں
ہائے اُسنے مجھے جانے نہ دیا اُدھر میں

کون رویا ہے ترے کوچے میں رات
کیوں سفیدی اُڑ گئی دیوار کی

اللہ رے سوزِ سینہ کہ دامان چرخ میں
شعلہ لپیٹ گیا نفسِ آتشیں کیسا تھا

ہم مر گئے اور اس نے نہ جانا کہ مر گئے
ہر زخم پر جو ہلتے تھے لب آفریں کیسا

واں رسم اختلاط سے انکارِ وعدہ تھا
یاں جان ہی نکل گئی اپنی نہیں کیسا تھا

طوفانِ نوح و گریۂ اکبر میں فرق ہے
یعنی کہ آسمان کو ڈبویا زمیں کے ساتھ

فارسی میں بھی شعر کہتے تھے مگر کلام دستیاب نہوا۔

نواب محمد اصغر علیخاں نسیم دہلوی۔ ابن نواب آقا علیخاں قاچار۔ یہ دلی کے خاندانی رئیس تھے۔ جب تباہی آئی تو ترکِ وطن کرکے لکھنو چلے آئے یہ مومن کے ان تلامذہ میں سے تھے جنہوں نے مشاعروں کے ذریعہ سے دھلی اور لکھنو میں مومن کے نام کو روشن کیا۔ ناسخ و آتش کے عہد میں آبرو پائی۔ اُنکے نامی تلامذہ بحر۔ رشک برق۔ وزیر۔ خلیل۔ وغیرہ کے ہمصحبت اور ہمعصر رہے دیوان نسیم چھوڑا جسکو تلامذہ نے ترتیب دیکر چھپوایا۔ انکا یہ کارنامہ تعجب کے لایق ہے کہ جسوقت لکھنو۔ دھلی کے فیضان کا محتاج نہ تھا اپنی شاعری کا ڈنکا بجایا اور دلی والوں کے ظرف

سے لکھنو والوں کو تنہا مخاطب کرکے کہا کہ ؎

نسیم دہلوی ہم موجد باب فصاحت ہیں
کوئی اردو کو کیا سمجھیگا جیسا ہم سمجھتے ہیں

تلامذہ میں انکے منشی امیر اللہ تسلیم ۔ منشی اشرف علی اشرف ۔ افسر ۔ مہر ۔ عاشق وغیرہ نام آور ہوئے ۔ وارستگی سے ناچار تھے ۔ اپنے شاگرد اور کفیل نواب محمد تقی خان افسر کے اصرار سے بوستان خیال نظم کرنے بیٹھے مگر اسکی بھی تکمیل نہو سکی ناچار ۔ نواب نے منشی طوطہ رام کا منہ چنوں کے عوض موتیوں سے بھر کے کتاب ختم کرائی چنانچہ طوطہ رام صاحب خود لکھتے ہیں کہ ؎

لکھا یا نتک نسیم دہلوی نے
لکھا ہے یاں سے طوطہ رام جی نے

انکو اخیر عمر میں کیمیا کا شوق ہو گیا تھا شبانہ روز گھر کے اندر اسی دھن میں رہتے تھے ۔

سنہ ۱۲ھ انکا کچھ حال اردو بیگم صاحبہ نے بھی لکھا ہے ۔ انکی فیاضیوں کا قصہ لکھنو کے کوچہ و بازار میں مشہور ہے اُستاد تسلیم فرماتے تھے کہ انکے مکان کے سامنے ایک گوشہ گیر خانہ نشین تباہ حال مرزا صاحب رہتے تھے جب اُنپر فاقے ہونے لگے تو انکی بی بی نے اس پر مجبور کیا کہ نواب کے پاس جاؤ چنانچہ یہ ایکروز آئے مگر غیرت شرافت سے کچھ کہہ نہ سکے اس رئیس مردم شناس نے انکو دیکھ کے ایک عمل دست غیب کا ذکر چھیڑ دیا اور کہا کہ مرزا صاحب ہر شب جمعہ میں آپ دروازہ کو اندھیرا کرکے ایک ہاتھ باہر نکال لیں اور آنکھونکو بند کرکے قرآن کی فلاں آیت مع درود شریف ایکسو ایک بار پڑھ لیا کریں مردان غیب جو آپکے مقدور کا ہوگا بے طلب دے جایا کرینگے ۔ چنانچہ جب آدھی رات ہوتی تھی اور گلی میں سناٹا ہو جایا کرتا تھا تو نواب خود انکے ہاتھ میں اک مناسب رقم جا کے دے آیا کرتے تھے یہانتک کے مرزا صاحب کی عمر کا بڑا حصہ آبرو کے ساتھ گزر گیا نواب کی موت کے بعد وہ نہایت خستہ حال ایکروز بازار میں اُستاد سے ملے پیٹ کر رونے لگے اور کہا کہ افسوس نواب کے بعد وہ بات جاتی رہی اُستاد تاڑ گئے کہ مرزا غریب کیسے یہ سب انہی مرحوم کی پوشیدہ فیاضی تھی ۔ ہائے اب کیا ایسے پاک طینت نفوس کبھی نظر نہ آئینگے ؎ میر ضیا دہلوی

ضیا کیا درد مضمن ہو ترے دل میں میاں پیچ
کہ جب تو بات کرتا ہے تو ٹھنڈے سانس بھرتا ہے

یہانتک کہ چند روز بیمار رہکر راہی ملک جنان ہوئے۔ مصحفی کے نامی شاگرد منشی مظفر علی اسیر نے تاریخ لکھی ع

شد بحور انِ ارم از چمن دہر نسیم

نسیم کی موت کے بعد نواب ملکوتی صفات نے خرچ راہ دیکر انکی بی بی کو حج کیلئے بھیجدیا جہاں سے وہ پھر نہ پلٹیں۔ اک اور منکوحہ تھیں وہ بھی مرگئیں۔ ایک لڑکا تھا وہ ماں کیساتھ جو حج کو گیا تو واپس نہیں ہوا۔ نسیم کا دیوان مطبوعہ ہر جگہ ملتا ہی مگر پھر بھی چند شعر نذر ناظرین کئے دیتا ہوں۔ زبان انکی متروکات سے پاک ہی کلام میں دہلی کی جھلک کم اور لکھنو کا رنگ زیادہ ہی بہر حال پھر بھی یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہی کہ کلام اور فن کے لحاظ سے تلامذہ مومن میں انکا درجہ بہت بلند ہے۔ یہ اشعار گہر بار انکے ہیں۔ جنمیں بلند پروازی و نازک خیالی بھی ہے۔

خالی نہیں فلک بھی جنوں کے عذاب سے — پہنے ہی طوق دایرۂ آفتاب سے
رہتی نہیں کسیکی ہمیشہ برہنگی — پائی زمین نے چادر نور آفتاب سے
یہانتک اوج جنوں میں مجھے کمال ہوا — خراشِ ناخن دیوانگی ہلال ہوا
ہاتھ میں خنجر کمر میں تیغ تیز — یہ ارادے ایک مشت خاک کے
جوانی و حسن و جاہ و دولت یہ چند انفاس کے ہیں جھگڑے
اجل ہی استادہ دست بستہ نوید رخصت ہر ایک دم ہے

ذیل کے اشعار کی پاکیزگی ملاحظہ ہو۔

حاجت شمع نہ پروانے چراغ لحد ہی — پاک احسان سے مزار غربا ہوتا ہے
آنکھیں وعدہ فراموش کہ فرصت کم ہے — دم کوئی دم میں قدمبوس قضا ہوتا ہے
اے نسیم چمن آرائے فصاحت تجھسے — معنی گلشن نوخیز ہرا ہوتا ہے
سینے میں سے کچھ آئی آواز — پھوٹا کوئی آبلہ جگر کا

جی ہی تو ہے کیا عجب بہل جائے ۔ کچھ ہم ذکر گبر و دیر اُدھر کا
کسی صورت سے دل کو شاد کرنا ۔ ہمیں دشمن سمجھ کر یاد کرنا
جنازہ اُٹھ چکے میرا تو تم بھی ۔ ادا رسم مبارکباد کرنا

میر حسین تسکین ۔

یہ دلی کے ایک سپاہی زادے تھے ۔ اور مومن کے ان سعادتمند تلامذہ میں سے ہیں جنہوں نے اوّل اوّل مومن کا دیوان صاف کیا تھا ۔ اور وہ نسخہ ہنوز موجود ہے جسکا ذکر کر چکا ہوں ۔ آگہی انہیں کے صاحبزادے تھے ۔

تسکین کی شاعری کے نسبت میرا یہ فیصلہ ہے کہ اگر زندگی انکی وفا کرتی تو یہ میر مہدی مجروح کے برابر ہوتے ۔ آج بھی اپنی شیرینی زبان کے سبب انکی شہرت ان سے کم نہیں ۔ چند ابتدائی غزلیں علامہ صہبائی کو بھی دکھلائی تھیں مگر جب مومن کے یہاں آئے تو انہیں کے نام پر خاتمہ ہوا جوان ہی مرے ۔ ایسے ایسے زبردست تلامذہ میں اگر کوئی بھی زندہ رہتا تو مومن دنیا سے ناکام نہ جاتے ۔ یہ کلام بلاغت نظام ہے ۔

گیا مجنوں نکل صحرا کو یہ دیوانگی دیکھو ۔ فضائے کوچۂ لیلیٰ کو اُسنے تنگ ٹھہرایا
وحشت اب لاش کو لے بھاگے گی ۔ تنگیٔ گور سے گھر یاد آیا
کوچۂ یار میں بیٹھے تسکین ۔ پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا
چین سے بیٹھے تری محفل میں تسکیں رات بھر ۔ اُس نے پہچانا نہ ہمکو رنگ کی تغییر سے
تسکیں نے لیکے نام ترا وقت مرگ آہ ۔ کیا جانیں کیا کہا تھا کسی نے سنا نہیں
قاصد آیا ہے وہاں سے تو ذرا تھم تو سہی ۔ بات تو کرنے دے اُس سے دل بیتاب مجھے
فتنۂ محشر کا تھا سب کو گماں ۔ تجکو پہچانا تری رفتار نے
کیوں ٹھہریوں پر جنگ سگان سر کو ہے ۔ وارث ہیں یہ کیا عاشق مسکیں کے تہائے
دیکھیو خانہ خرابی غیر واں قابض ہوا ۔ جسکے گھر کو ہم سمجھتے تھے کہ اپنا ہو گیا

میر مجروح کا جو ذکر ابھی کیا ہے تو انکا بھی دو اک شعر سنتے جاؤ اور اگر انکی تصویر دیکھنی چاہو تو رسالہ ادیب کے صفحات میں دیکھو ؎

وہاں کی بھی ہے سیر کرنی ضرور — سفینے کو جانے دو گرداب میں

اغیار کے آنے کے دکھا دینگے نشاں اور — بس آپ نہ کھلوائیے اب میری زباں اور

آہی — میر عبد الرحمٰن خلف میر حسین تسکین مرحوم —

انکا ذکر آگے آچکا ہے۔ افسوس دیوان انکا چھپا نہیں کچھ اشعار جو مشکل سے دستیاب ہوئے ہیں درج کئے دیتا ہوں۔ کلام انکا باپ کے انداز اور مومن کے رنگ سے مشابہ ہے۔ سنو۔

ہے غلط وہم کہ نکلا تھا وہ گھر سے باہر — شہر میں چاک کسیکا تو گریباں ہوتا

اُٹھ کہیں ہے آمد آمد اس ستمگر کی یہاں — اہل محشر مجکو یہ مژدہ سنا کر رہ گئے

افسوس انہوں نے بھی عمر طبعی نہ پائی —

آشفتہ — حکیم منور علی خلف سید علی رضوی مرحوم — ساکن الور —

انکا ذکر بھی آگے آچکا ہے اب انکی اولاد کے آگے دست سوال پھیلائے کھڑا ہوں خدا انکے در سے ناکامیاب ہی کیوں نہ پھر جاؤں ؎ میر

قلم چل بھی تیری چلتی زباں ہے — کہ پھر بات کرنے کی فرصت کہاں ہے

آشفتہ کا کلام بھی سن لو ؎

سنا تھا ہمنے آشفتہ کو کوئی دم کا مہماں ہے — کئی دن ہو گئے اسکو نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے

بہت روتے تو اپنی جان کھوتی — کسیکا ہمنے بتلا دیا کیا

قلق — حکیم مولا بخش میرٹھی —

تلامذہ مومن میں یہ بیچارے بھی غنیمت ہیں بہت صاف لکھتے ہیں۔

دیکھو ستم ظریفی دود دل جگر کی — اک آسمان کو پہونچا اک آسماں بنایا

فصلِ بہار اپنی گذری تو یوں ہی ساری — یاں آشیاں بنایا واں آشیاں بنایا

بیتاب۔ صاحبزادہ نواب عباس علیخاں رامپوری۔

ارکانِ ریاست میں سے تھے۔ اور اسی زمانہ میں مومن کے شاگرد بھی ہوئے جب وہ رامپور تشریف لیگئے تھے۔ انداز بیاں سے پتہ چلتا ہی کہ بلند طبع و باخبر شعرا میں تھے۔ دیوان معدوم مگر مشکل سے ایک شعر اور ایک قطعہ ہاتھ آیا ہے۔ جو پیش کرتا ہوں ؎

دید سے روزِ جزا کے بھی رہونگا محروم — یہ نظر آتی ہی طولِ شبِ ہجراں مجکو

قطعہ

معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ — ساقی اگر نہیں ہی نہ ہو مئے سے کام ہی

بیتاب پی خدا نے دیئے ہیں تجھے بھی ہاتھ — یہ خم ہی یہ سبو ہے۔ یہ شیشہ یہ جام ہی

بیمار۔ شیخ علی بخش سنبھل مرادآبادی۔

نظام شاہ رامپوری کے تذکرہ شعرا سے صرف اتنا پتہ چلا کہ یہ مومن خاں کے شاگرد تھے اور اشعار سے اتنا کھلا کہ نہایت نازک خیال تھے۔ ذیل میں دو شعر لکھے جاتے ہیں۔

لبِ جو کون سیر کو آیا — موج منہ چومتی ہی ساحل کا

سانس آہستہ لیجیو بیمار — ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

بارک اللہ واہ کیا کہنا۔

ہوس۔ شہزادہ مرزا غلام فخر الدین برادر شہزادہ مرزا صابر دہلوی مرحوم۔

یہ مومن کے شاگرد تلامذہ میں تھے۔ کلام انکا غدر میں تلف ہو گیا صرف ایک شعر جو سنا وہ درج کرتا ہوں۔ ع مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے ؎

اب ہے کیا باقی جو کاوش ہی تری دستِ جنوں — چاک دامن ہو گیا ٹکڑے گریباں ہو گیا

لگے ہاتھوں شہزادہ مرزا صابر کا بھی ایک شعر سن لو۔ یہ اخیر عمر میں دہلی کو ترک کر کے بنارس چلے آئے اور یہیں خاکی چادر اوڑھے ہوئے سوتے ہیں مرزا داغ کو جب کسی

محاورہ میں شک پیدا ہوتا تھا تو انہیں سے پوچھتے تھے۔ ~ صابر

جہاں سے یگانہ ہیں بیگانگی کی   شہید اس زمانہ کا ایسا ہوں

برق۔ قاضی نجم الدین ابن قاضی سراج الدین سکندر آبادی۔

آپ بھی مومن کے ہمنشیں اور تلامذہ میں سے ہیں۔ اونچا قد۔ سانولا رنگ۔ نہایت وضعدار۔ خوش مزاج آدمی تھے۔ سر پر لمبے لمبے بال رکھتے تھے۔ مومن کی عدیم الفرصتی میں تسکین کو بھی اپنا کلام دکھا لیتے تھے۔ یہ اشعار انکے ہیں ~

وحشی نے تیرے خاک اڑائی یہاں تلک   ملتا نہیں زمیں کا پتہ آسماں تلک

بزم اغیار سے اٹھے نہ خفا تو ہو جائے   ورنہ اک آہ میں کھینچوں تو ابھی ہُو ہو جائے

راحت۔ مرزا محمود بیگ دہلوی

یہ فراش خانہ میں رہتے تھے۔ حکیم مومن خاں کے شاگرد تھے۔ چونکہ خاکسار کی شادی اسی محلہ میں صوبہ دار مرزا عبداللہ بیگ کی پوتی سے ہوئی تھی اسلئے یہاں کے لوگوں سے نام انکا سنا مگر افسوس کہ مفصل حال معلوم نہوا۔ صرف ایک شعر ان کا مشہور ہے ~

ہنسے تو وہ بھی چھٹے اور دل شیدا چھوٹا   یاد کس کس کو کریں جس سے چھٹا چھوڑا

سالک۔ مرزا قربان علی بیگ مرحوم

یہ مومن کے قدیم اور اچھے تلامذہ میں تھے چونکہ مومن کی حیات تک مشق انکی ناتمام تھی غالب سے اصلاح لینے لگے۔ صاحب دیوان ہیں۔ مومن کا انداز انکے شعروں میں دیکھ لو۔

دل وہ کافر ہے کہ مجھ کو نہ دیا چین کبھی   بیوفا تو بھی اسے لیکے پشیماں ہوگا

جب تلک کے تری راہ میں بیٹھے تو کہا چل   جو کہو سنتے ہوئے ہیں وہی کچھ پاتے ہوئے ہیں

یوں عمر گذاری تری فرقت میں کہ ہر دم   جینے کا گماں تھا مجھے مرنے کا یقین تھا

راسخ۔ سعادت علیخاں متوطن دہلی۔
یہ نام و نشان اُٹھے۔ مومن کے تلامذہ میں تھے ایک شعر انکا تذکرہ والوں نے
لکھا ہے ؎

ہوں تو آنکھوں میں پر نہیں یہ خبر سُرمہ ہوں یا غبار ہوں کیا ہوں

صاحب۔ یہ بھی امتہ الفاطمہ بیگم عرف صاحب جی۔ زن پردہ نشین
تھی وہ ہیں جنھوں نے مومن کے عشق کا بیڑا اٹھایا تھا۔ انکا حال آگے لکھ چکا ہوں۔
یہاں صرف انکے چند اشعار پر تذکرہ ختم کرتا ہوں۔
مومن خاں صاحب کے سامنے جلنے جلانے کا مسئلہ پیش کرتی ہیں اور اس طرح ان کے
عشق کی آگ کو بھڑکانے کو کہتی ہیں کہ ؎

رقیبوں کا جلنا کہاں دیکھتا تُو سماں یہ مرے گھر میں آیا تو دیکھا

اب پھر انکے زہد پر توجہ فرماتے ہوئے کہتی ہیں کہ ؎

گنہ کیا صنم کے نظارے میں زاہد خدا نے یہ جلوہ دکھایا تو دیکھا

اب اپنی نامرادی پر جھلاتی ہیں کہ ؎

جو خط جبیں کا ہے کاتب ہو اُسی کو دکھلا تو مرا نامۂ اعمال الٰہی

اس شعر میں مومن کو کن انکھیوں سے دیکھ کے بارگاہ واہب العطایا میں ہاتھ اٹھاتی
ہیں کہ ؎

صاحب جو بنایا ہے تو مانند زلیخا یوسف سا غلام اک مجھے دے ڈال الٰہی

چنانچہ وہ کچھ عجیب ساعت تھی کہ انکی دعا قبول ہو گئی اور مومن سا غیور شخص انکا
بندۂ بے دام ہو گیا۔
عظمت۔ پیر عظمت اللہ ولد پیر قدرت اللہ جذب دہلوی۔
یہ پیرزادے بھی مومن کے شاگرد ہیں۔ اور اپنے فقر و فاقہ پر کہ فقیروں کی میراث ہے

شان ہو تنظر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ
نام عظمت ہے نہ شوکت نہ شکوہ　　　کیا ہی اس نام سے گھبراتا ہوں

صفیر میاں جان دہلوی ۔

(میر) حقارت سے دیکھو نہ یہ ٹوٹی قبریں　　　کہ ہر میں فلاں بن فلاں بن فلاں ہے
یہ اس مشاعرہ کے دیکھنے والوں میں ہیں جنہیں مومن و غالب وغیرہ کی غزلیں پڑھی گئی تھیں۔ ایک شعر انکا ہمرنگ مومن ہی وہ ملاحظہ ہو ۔
ہوا ہو سہو۔ تو پھر خوب یاد کر لیجئے　　　کہ رہ نجائے کوئی جور آسماں کے لئے

قیصر۔ شہزادہ مرزا خدا بخش قیصر نواسہ شاہ عالم بادشاہ دھلی ۔

مومن کے مشہور تلامذوں میں ہیں آخیر عمر تک مشاعرہ کرتے رہے اور مومن ہی شعر کہا ہوا کئے مجمع الاشعار میں انکا بہت کچھ کلام موجود ہے یہاں ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں ۔
تو لطف کرے یا نہ کرے خوش ہو کہ ناخوش　　　اس بات پہ مرتا ہوں کہ عاشق ہے ترا ایں

کاظم۔ منشی کاظم علی متوطن ضلع بجنور ۔

مومن کے قدیم تلامذہ میں تھے کچھ کلام انکا ملا نہیں صرف یہ شعر سنا ہے ۔
اے طفلِ اشک ہم تجھے آنکھوں میں یوں رکھیں
اور تو ہمارے راز کو یوں برملا کرے

واقعی یہ اسکو لازم نہیں ۔

مکرم۔ غلام علی ضامن ۔ دھلوی ۔

انکی عمر کا بڑا حصہ حیدرآباد میں گذرا مرتے وقت عہدِ نواب صدیق حسن میں بھوپال آئے اور یہیں کی خاک میں مل گئے آواز انکی بہت بلند تھی مشاعرے پہ چھا جاتی تھی کلام ملاحظہ ہو ۔
ہاتھ ہو دیگا مرا اور ترا دامن ہو گا　　　چاک جب صبح قیامت کا گریبان ہو گا

عاشق مزاج تھے بے سروسامانی میں بسر ہوئی بے سروسامان اُٹھے یعنی ؎

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط　　بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

غلام علیخاں وحشت ابن میر فرحت اللہ خاں مُرادآبادی

یہ مومن کے ارشد تلامذہ میں غالب و شیفتہ کے ہم صحبت تھے۔ علاوہ عربی فارسی کے انگریزی تعلیم بھی انکی بنارس اور مرزاپور میں ہوئی۔ بلند شہر میں سرکار انگریزی کی ممتاز ملازمت پر سرفراز رہے۔ حالی مرحوم نے لکھا ہے کہ مومن کے بعد بھی جب یہ غالب سے ملنے جاتے تھے تو وہ بہت عزت سے پیش آتے تھے اور لپٹ کے کہتے تھے کہ بھئی وحشت۔ زندگی سے وحشت ہو رہی ہے اب وقت قریب ہے یعنی ؎

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

غالب اسی امید میں زندگی کے دن پورے کر رہے تھے مگر مشیت کہ انکی آنکھوں کے سامنے وحشت و شیفتہ بھی مر گئے اور آخر یہ ہوا کہ حالی نے انکا مرثیہ لکھا۔

وحشت کا کلامِ بلاغت نظام دیکھو قدم قدم پر شانِ استادی نمایاں ہے ؎

تھی بس مرضیِ قاتل تو جدا زندہ ہوا　　روزِ محشر مرے تن۔ تن سے سر میرا
میرے مرنے کی خبر غیر کو یوں دیتے ہیں　　مر گیا وحشتِ جانباز تری جاں سے دور
جو نہ جاتا ہو کہیں کوچۂ جاناں سے سوا　　ایسے دیوانے کو کچھ حاجتِ زنجیر نہیں
جوشِ وحشت سے یہ حالت ہے کہ سایہ مجھ سے　　یوں گریزاں ہے کہ سایہ سے گریزاں میں ہوا
میں تو انساں ہوں یہ بیتابیِ دل ہے وہ بلا　　ہجر کی شب خواب اُچٹاتا ہے فرشِ خواب سے
گرمِ غم خانہ سے اتنا آہِ آتش بار سے　　بھاگتی ہے دھوپ میری سایۂ دیوار سے

کیا شعر فرمایا ہے۔ بے سبب سرسید انکے مداح نہیں ؎

اُٹھا نے کو کسی نے پھر نہ میری آستیں پکڑی
برنگِ نقشِ پا اُس در پہ جب میں نے زمیں پکڑی

ہائے ہائے کیسے کیسے تلامذہ منتخب خانصاحب کے نامراد مرگئے انکا دیوان بھی نہ چھپا یہ سبب اولاد کے بد مذاقی کی برکت ـ

پاس خیر الدین مرحوم دھلوی ـ

انکا کچھ حال آگے لکھ چکا ہوں ـ مومن خاں کے یہ ہمنشین اور شاگردوں میں تھے مختصر یہ کہ گمنام و نامآور تلامذہ کا حال دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ مومن کی بھٹی میں شرابِ عشق کے طالب بہت آئے اور برعکس اسکے غالب کے یہاں رند مشرب اور زمین آسمان کے قلابہ ملانے والے گئے ـ

مومن کے گرد انکے جب چند ہمرنگ تلامذہ جمع ہو جاتے تھے تو مومن کے بے تکلف احباب یہ شعر ثناء اللہ خاں فراق دہلوی کا پڑھتے تھے جسکو سُنکے وہ خوش ہو جاتے تھے ؎

رہتا ہے عاشقوں سے انبوہ ہجوم در پہ	ہو جائیگا کہیں اُسکا بازار رفتہ رفتہ

اس شعر نے داغ دل تازہ کر دیا ـ مولوی امیر الدین احمد امیر جو عیش یاد گار مصحفی کے شاگرد اور ہمارے بڑے بھائی تھے اور جنہوں نے ابھی چند مہینے ہوے کہ انتقال کیا ہو اونکے کچھ شعر اسی زمین میں یادگار رہیں بغرض بقاے نام پیشکش خدمت ناظرین کرتا ہوں شعر اول یہ اپنے مرض ضیق النفس کیطرف اشارہ کرتے ہیں اور یہ اشعار بھی موت کے چند روز پہلے کے ہیں ـ اب عدالت کچہری میں بیٹھنکا اونہیں اوقع تو تھیں تھے ـ اس فن کا کمال اپنے ساتھ لیگئے ؎

دم تنگ سے پڑا ہے رستے ہی میں پڑا ہوں	منزل پہ جا ہی پہونچے سب یار رفتہ رفتہ
کچھ روز اول اول آتے تھے قبر پر سب	وہ فاتحہ بھی بھولے غم خوار رفتہ رفتہ
تلوے میں چبھ گئے ہیں جو اے امیر خستہ	نکلینگے کاوشوں سے وہ خار رفتہ رفتہ

خیر گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشان ہر مزار ہوں میں

لو یاس کا اک شعر سنتے جاؤ ؎

شربتِ وصل نہ پینے دو نہ سم کھانے دو   کیا قیامت ہے نہ جینے دو نہ مرجانے دو

مومن کی موت

ہائے   کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس
عروج مہر جو دیکھا تو دوپہر دیکھا

کل نفس ذائقۃ الموت۔ کوئی عالم ہو کہ فاضل حکیم ہو کہ ڈاکٹر۔ فقیر ہو کہ بادشاہ پیغمبر ہو کہ ولی۔ شاعر ہو کہ نثار۔ اسکو ایک روز مرنا ضرور ہے۔ اور جو کوئی چاہ عدم میں گرا وہ گرا۔ پھر نہ نکلا۔ ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد۔ افسوس اپنی آنکھوں سے روز دنیائے فانی کا نقشہ دیکھ رہے ہیں اپنے عزیزوں اور دوستوں کو خود گورستان میں جا کے تہ خاک کر آتے ہیں مگر اپنے مرنے کا یقین نہیں۔ دم کا ٹھکانا معلوم اور سو برس کا سامان مہیا ہے۔ حالانکہ انقلاباتِ ہستی ہر وقت پکار پکار کے کہہ رہے ہیں کہ میاں ؎

نہ دیکھو گے کبھی تم خواب میں بھی خواب دنیا کا   پڑا رہ جائیگا مرنے پہ سب اسباب دنیا کا

مگر اسکو دل لگی جانتے ہیں۔ آمدم بر سر مطلب

حکیم مومن خاں بالکل بھلے چنگے تھے۔ کسی بل انکے دم خم میں کوئی فرق نہ آیا تھا ایک بال بھی سر کا نہ پکا تھا۔ نہ وضعداری میں کمی آئی تھی۔ عمر کے لحاظ سے بھی جبکہ قبل غدر ساٹھ برس کی عمر میں آدمی جوان ہوتا تھا یہ کچھ قریب پچپن برس کی عمر رکھتے تھے کہ انتقال کیا۔ دیکھنے میں چالیس بیالیس برس کے معلوم ہوتے تھے۔ صورت یہ ہوئی کہ وہ مکان جسکا نقشہ ابھی ابھی دکھلا چکا ہوں اسکی چھت مرمت ہو رہی تھی اور

کھولی گئی تھی نیچے سے مزدور اوپر کو کڑیاں دے رہے تھے یہ اُس مونڈیرے سے لگے ہوئے کھڑے تھے چھت کی اونچائی کم تھی یکایک جھکے اور ٹھوکر کھا کے کوٹھے سے نیچے آ پڑے۔ گرتے ہی بیہوش ہوگئے۔ گھر میں کہرام اور محلے میں ہنگامہ ہوگیا۔ بی بی بچوں نے سر پیٹنا شروع کیا ناصر نذیر صاحب فراق کے والد کہ مومن کے عزیز اور شاگرد تھے دوڑ پڑے اور خانصاحب کو اُٹھا کے پیچھے کمرے میں لٹایا عزیزوں شاگردوں اور دوستوں کی آمد شروع ہوئی جنہیں آہی بہی تھے۔ اُنکے طرف دیکھ کے جب ہوش میں آئے تو فرمایا کہ میاں جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہوا۔ مگر میرا علم یہ کہتا ہے کہ میں صرف پانچ مہینے بچونگا۔ لو میرے مرنے کی تاریخ لکھ رکھو۔ دست و بازو بشکست۔ ۱۲ھ ۶۸
آخر وہی ہوا۔ غدر سے پہلے سرجری علاج کرنے والے۔ ڈاکٹر کہاں تھے۔ جراحوں اور طبیبوں نے کئے جو ہو سکا کیا آخر جمعہ کے روز صبح کا وقت تھا کہ دنیا سے کوچ فرمایا۔ اور ہوش و حواس میں ہنستے بولتے۔ چلے گئے اعلےٰ علیین میں انکی روح پاک نے مقام پایا۔ حسب ہدایت انکا جنازہ مہندیوں میں کہ مشہور اور پرانا گورستان دھلی کا ہے لایا گیا اور یہیں دفن ہوئے۔ نماز مسجد جامع میں ہوئی۔ شہر کے امیر غریب علما فضلا۔ شعرا۔ شہزادے سب جنازہ کے ساتھ تھے۔ اور سب نے انکی جوانمرگی کا سوگ رکھا۔ غالب تو غالب ذوق کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل پڑے۔ اور ہر بزم میں یہی چرچا تھا کہ دھلی کا چراغ بجھ گیا۔ مزار آپکا زیر احاطہ دیوار مقبرہ مولانا شاہ عبدالعزیز رحمہ باہر کے سمت بجانب شرق واقع ہے۔ کوئی کتبہ نہیں کوئی نشان نہیں یہ عزیزوں اور شاگردوں کی اہلیت ہے اس گورستان کی بہترین تصویر ملاحظہ ہو تخمیس عرش بر شعر تسلیم۔

ہے کہاں یاران رفتہ میں زبان التماس — بیکسی سر پیٹتی تھی اک طرف اک سمت یاس
منہدم لوحیں تھیں۔ تھے خار مغیلاں آس پاس — خشک گل افسردہ سبزہ شمع چپ بالیں اداس

جی بھر آیا عالم گورِ غریباں دیکھ کر

انکے مرنے کی تاریخیں بہت لکھی گیئں مگر آہی نے ماتم مومن خاں سے سال نکالا ہے ۔

گو ایک صدی ہونے آئی مگر ابھی چند بوڑھے دہلی میں ہیں جو انکے نشانِ مزار کے بتانے والے ہیں اور یہ انکی مقبولیت او شہرت کے سبب سے ہے ورنہ بڑے بڑوں کے مزار کا پتہ نہیں بہر حال انکے لب گور سے اہل گوش تک یہ صدا آج بھی پیہم آتی ہے کہ

جنت میں روح جسم ہو نیچے مزار کے ۔۔۔ کشتی ہماری ڈوب گئی پار اُتار کے

انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

زمین پہ سوتے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو ۔۔۔ اجل کہاں سے کہاں لائی ہے مکینوں کو

مومن پر اعتراض ۔

انکی حیات تک تو کسی کے منہ میں زبان نہ تھی ۔ مگر آزاد صاحب کو مرنے کا انتظار تھا آپ نے بے بصیرتی کے سبب کچھ اعتراضات اپنی کتاب میں بغیر تحقیق ٹانک دئے ۔ اور ویسے اعترضوں کو چالاکی سے ڈھانک دیا جو ذوق پر بھی ہو سکتے تھے ۔ خیر میر

ہم ہیں مجروح ماجرا ہے یہ ۔۔۔ وہ نمک چھڑکے ہے مزا ہے یہ

پہلے میں ان اعتراضات کا جواب دیتا ہوں جو اور حضرات کے طرف سے ہوئے اب اُنکو ملاحظہ فرمایئے ۔ مومن

مجھ پہ طوفاں اُٹھاتے لوگوں نے ۔۔۔ مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے

کہا جاتا ہے کہ مصرع آخر کی ردیف بیکار ہے ۔ بجا ارشاد ہوا ۔ اب سندیں ملاحظہ ہوں ۔ خواجہ وزیر ۔

ذکر جب ایجان تری رنگین بیانی کا ہوا ۔۔۔ رہ گئی حسرت سے بلبل کھول کر منقار کو

مرزا دبیر ۔

شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو　　جبریل لرزتے تھے سمیٹے ہوئے پر کو

مرزا غالب ؎

درد سے میرے ہے تجکو بیقراری ہائے ہائے　　کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

ردیف میں حشو کا عیب تو ہزار جگہ دکھلا سکتا ہوں۔ اندرون شعر حشو سے خالی نہیں ہے ردیف کا کیا ذکر۔ آتش مرحوم ؎

پڑے ہو غش میں کیا مردہ سنو آتش اٹھ کو کہو لو　　خبر کے واسطے اُس بت نے بھیجا ہے برہمن کو

دوسرا اعتراض۔ حالت عطف و اضافت میں اعلان نون کا قایم رہنا کن کن صورتوں میں اعلان نون جائز ہے اسکی بحث طویل ہے پھر بھی جس موقع پہ ناجائز کہا جاتا ہے وہ بیشک مومن کے شعر میں موجود ہے ؎ مومن

فردوسی ایک خارجنان بیان تھا　　گلریز میرے دم سے ہوئی داستان تیغ

یہاں بیان کے نون کا اعلان غلط ہے۔ قبل اسکے کہ میں جواب دوں ایک امر ملحوظ خاطر رہے کہ مومن غدر سے پہلے کے اساتذہ میں سے ہیں آپکو سند بھی انہی استادوں کی چاہیے جو قبل عہد مومن یا ہم عہد مومن تھے۔

غالب مرحوم ؎

مسکن لباس کعبہ علی کے قدم سے جان　　ناف زمین ہے نہ کہ ناف غزال ہے

بہادر شاہ ظفر کا شعر ہے اور ذوق کے مصرعے ہیں ؎ آبحیات صفحہ ۴۷۳ ملاحظہ ہو ؎

اس خرد نے مجھے سرگشتہ و حیران کیا　　کیوں خردمند بنایا نہ بنایا ہوتا

تو نے اپنا مجھے دیوانہ بنایا ہوتا

ذوق مرحوم ؎

پیر روئے پھوٹ پھوٹ کے پاؤں کے آبلے   نالہ سا ایک سوئے بیابان بہہ گیا

میر تقی میر سے

حال زبون اپنا پوشیدہ کچھ نہ تھا تو   سنتا نہ تھا کہ صید بیجان ہو رہا ہے

آزاد صاحب کا ذاتی اعتراض۔ مومن سے

دل ایسے شوخ کو مومن نے دیدیا کہ جو ہے   محب حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا

فرماتے ہیں کہ شمر بروزن اثر خلاف لغت ہے۔ بجا ارشاد ہوا مگر ایک کیا ایسے صدہا الفاظ اساتذہ مستند کی زبان پر غلط مروج ہیں۔

دوات کو داوات بنات کو نبات تو عام طور پر بولتے ہیں اور یہی ایسے الفاظ کا رسالہ ازاحۃ الاغلاط مولفہ مولانا ظہیر احسن شوق نیموی اور تصحیح اللغات مولفہ مولوی رفیع احمد صاحب عالی وکیل بدایوں تلامذہ تسلیم کے دیکھنے سے پتہ چلیگا۔ اب جو یہ بحث ہو کہ شعر میں ایسی غلطیوں کو دکھلاؤ تو لو وہ بھی دیکھ لو۔

تسلیم سے

کچھ تو رہتا اتحاد جوہر قاتل بعد مرگ   کاش آب تیغ بہر غسل میت مانگتا

یہاں تربیت کے وزن پر میت قطعاً غلط ہے۔

اب رہ گیا اک اور اعتراض یعنی اُنکی ترکیبیں اور اضافتیں غیر مانوس ہیں جیسے۔ زبان اجابت نشان۔ دم خونابہ ریز۔ تیر یار۔ زخم ریز۔ قدم فرسا وغیرہ ان ترکیبوں پر غلط ہونے کا تو اطلاق نہیں ہوسکتا ہے رہ گیا اجتہاد مومن سے اختلاف وہ آپکو اختیار ہے مگر میرے خیال میں انہیں ترکیبوں کے بدولت وہ مومن ہیں ورنہ ذوق سے ہی بدتر او رکمتر سمجھے جاتے۔ انہیں اچھوتی ترکیبوں کے تقلید کی حسرت اک حسرت کو کیا ہزاروں کو ہے مگر معنی آفرینی ہیں کامیابی کسی کو بھی نہیں سے

فکرِ میرے کہاں ہوتا ہے سودا کا جواب　　　ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ اُسی مغفور کا

بس کلیات بھر میں یہی چند غلطیاں بتائی جاتی ہیں جو اور اساتذہ کے مقابلہ میں بالکل نہیں ہونے کے برابر ہیں اور میرا تو یہ مذہب ہے کہ اساتذہ کی غلطی ہم مبتدیوں کیلئے سند ہے

اللہ اللہ خیر سلا مانو کہ نہ مانو ۔ سیدانشا

اک طفلِ دبستاں ہو فلاطوں مرے آگے　　　کیا مُنہ ہے ارسطو جو کرے چوں مرے آگے

مرغانِ اُولی اجنحہ مانند کبوتر　　　کرتے ہیں سدا عجز سے غوں غوں مرے آگے

خدا کا شکر کہ ابھی غلامانِ غلامِ مومن ہندوستان میں ہیں جو ایسے اعتراضات کو چٹکیوں میں اُڑا دیں۔ کتاب کی طوالت اور دنیا کی بدمزاقی کے سبب ہر جگہ اختصار سے کام لے رہا ہوں۔

خواب۔

وہی خواب جو نئی روشنی والوں کی نگاہ میں بے اصل اور خیالی تصور سے زیادہ نہیں اہلِ باطن کے یہاں منازلِ اعلیٰ کے طے ہونیکی اک راہِ مستقیم ہے۔ انکا صحیح و غلط ہونا بھی اپنی ضمیر پر ہے۔

مومن چونکہ اک ولی کے فیضان سے معمور تھے اسلئے نیک خیال والوں کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ جو اشارہ اُن کے طرف ہے وہ بے اصل نہیں۔ چنانچہ ذیل میں ہم اُن کے طرف چند خواب کو منسوب کرتے ہیں ۔ سلام مرحوم

حدیثِ زلف چشمِ یار سے پوچھ　　　درازی رات کی بیمار سے پوچھ

۱ انکی موت سے دو برس بعد نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے خواب میں دیکھا کہ قاصد آیا ہے اور مومن کا خط لایا ہے۔ جسکا مضمون یہ ہے کہ برسات کے سبب میرے عیال پر مکان کے طرف سے بڑی تکلیف ہے اونکی خبر لو۔ ذیل خط میں ایک مہر لگی ہوئی ہے جسمیں لکھا ہوا ہے۔ آنکھیں کھلیں تو اک کاغذ اپنے ہاتھ میں وہ

مومنِ جنتی

پاتے ہیں مگر حرف اُڑ گئے ہیں۔ ع۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے ہے

شیفتہ فوراً ہی خانصاحب کے مکان پر پہونچتے ہیں اور دریافت کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ چھت بُری طرح سے ٹپک رہی ہے۔ رات سے ان کے گھر والے بےچین ہیں چنانچہ واپس آکے دو سو روپیہ خانصاحب کے گھر بھجوا دیتے ہیں۔ یہ کوئی دل سے گھڑا ہوا خواب نہیں ہے بلکہ آج سے پچاسوں برس پہلے آزاد نے بھی لکھا ہے البتہ مومن کے گھر والوں کے بیان اور اُنکے لکھنے میں تھوڑا سا فرق ہے۔ خیر دعا ہے کہ خدا مومن کو مقامِ محمود عطا فرمائے۔

۲۔ اُستاد تسلیم مرحوم ہر پنجشنبہ کو مومن و نسیم کے نام فاتحہ دیا کرتے تھے وہ اُس عمل کا قصہ فرماتے تھے جب وہ مثنوی شامِ غریباں لکھ رہے تھے۔ کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ شب کا وقت ہے میں چراغ جلا کے لکھ رہا ہوں۔ مومن خاں آئے ہیں پوچھا کہ کیا لکھ رہے ہو سُناؤ میں نے کچھ اشعار مثنوی کے سُنائے۔ آپ نے فرمایا کہ مطلب سے اسقدر بعد ان شعروں کو یہاں سے نکال دو۔ اب جو بیدار ہوتے ہیں تو مثنوی پر غور کرتے ہیں اور واقعی چند شعروں کو بے ربط پاتے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ نے ان کو نکال دیا۔

۳۔ اب کہ مومن کو تقریباً اسّی برس ہو چکے میں نے خود خواب دیکھا کہ اپنے خانہ باغ میں شب کو ننگے سر بیٹھا ہوں۔ اور چاندنی رات ہے۔ فرش زمین پر بچھا ہوا ہے۔ کچھ کاغذاتِ غزل میرے سامنے ہیں اور مومن خانصاحب جو اپنی تصویر سے مشابہ ہیں سامنے بیٹھے ہوئے ہیں اُنکے آگے اک گٹھڑی کپڑوں کی کھلی ہوئی ہے اُس میں سے ایک ٹوپی اپنی جیسی کہ پہنتے تھے نکالی اور مجھکو پہنا دی۔ میری آنکھیں کھل گئیں اور اسکے متعلق غور کرتا رہا کچھ سمجھ میں آیا کچھ نہ آیا بہر حال اُنکے مٹتے ہوئے نام کو روشن کرنے کی دھن میں لگ گیا ہوں۔ خدا انکے فیضان کا سایہ میرے سر پر رکھے

اولادِ مومن ۔

سب کچھ خدا نے مجکو دیا عرش بے طلب دختر کی آرزو نہ تمنا پسر کی ہے

مومن کا جب انتقال ہوا ہے تو انکے صاحبزادے احمد نصیر خاں چھ سات سال کے تھے بعد مومن انکی تعلیم ننہالی رشتہ داروں کے طفیل میں ہوئی ۔ آدمی بہت ذہین تھے ۔ بارہ برس کی عمر میں حافظ ہوئے ۔ اُسوقت کے ایک مشہور عالم مولوی عبدالرّب صاحب تھے جنکا وعظ سننے کے ساتھ یہ دہرا دیتے تھے ہزاروں شعر عربی فارسی کے اُنکو یاد تھے مگر طبیعت موزوں نہ تھی ۔ اور اسی سبب سے انکو باپ کے خوان نعمت سے جو اصل شئے تھی نہ ملی ۔

گورے آدمی سر پر گھونگروالے بال ۔ بدن میں ململ کا انگرکھا ہوتا تھا ۔ انکو لالٹینوں سے بڑا شوق تھا اپنا دل خوش کرنے کو مختلف رنگ کے شیشوں سے اُنکو سجاتے تھے اور شب کو روشن کرتے تھے ۔ محمود کے ماموں ننھے خانصاحب کے یہاں حالی مرحوم کی اور انکی نشست تھی ۔ پچاس برس کی عمر میں دو لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑ کے دنیا سے کوچ کیا

ایک لڑکے کا نام عبدالوہاب تھا جو عربی فارسی کی تعلیم پانے کے بعد فقر کی طرف رجوع ہوئے اور عالم جذب میں دنیا سے چلے گئے ۔ میں نے خود مقبرہ ہمایوں کے طرف جنگلوں میں دیکھا تھا مگر یہ نہ جانتا تھا کہ یہ مومن کے پوتے ہیں ۔ دوسرے صاحبزادہ کا نام محمد نصیر ہے ۔ علمی ذکاوت اور محنت کے سبب تین سال مین انہوں نے فرسٹ ڈیویژن میں انٹرنس پاس کیا ۔ عربی فارسی سے بھی باخبر رہتے شعر بھی کچھ کہتے ہیں مگر مزاج وارستہ ہے ۔ آخری سفر جو خاکسار عرش نے دہلی کا کیا ۔ اُسوقت یہ وہاں موجود نہ تھے ۔ بہر حال مومن کی اولاد کو انکے نام کے روشن کرنے کا خیال نہوا ۔ اپنے جد بزرگوار کو نہ جانا نہ پہچانا ۔

احمد نصیر خانصاحب کی صاحبزادی ہنوز موجود ہیں انکا ذکر اپنی جگہ پر آئیگا۔

دختران مومن۔

مومن کا وہ قطعہ صفحات تاریخ میں موجود ہے یعنی ؎

نال کٹنے کے ساتھ مومن نے　　کہی تاریخ دختر مومن ۱۲۵۴ھ

یہی وہ صاحبزادی ہیں جنکی اہل اولاد کے بدولت آج یہ تذکرہ مالا مال ہے۔ بعض غیر محقق تاریخ نویس ایسے بھی ہیں جنہوں نے رسالہ نگار لکھنؤ کے مومن نمبر میں ایک جگہ کہا ہے کہ مومن کی لڑکی کا چار سال بعد انتقال ہو گیا تھا اور سند میں یہ مومن کا قطعہ پیش کر دیا ہے ؎

خاک بر فرق دولت دنیا　　من نشانم خزانہ بر سر خاک

صرف کتابوں کو دیکھ کے گھر بیٹھے خیالی گھوڑے دوڑانا اور بات ہے اور گھر سے نکل کے تحقیق کرنا اور چیز ہے بہرحال وہ دوسری صاحبزادی مومن کی تھیں جو بعالم شیر خوارگی انتقال کر گئیں اور وہ لڑکی جسکے متعلق دختر مومن والا قطعہ ہے وہ مومن کے بہت بعد غازی پور زمنیہ میں مولوی عبدالغنی[له] مرحوم وکیل ضلع بیتیا گیا سے بیاہی گئیں۔ مولوی عبدالغنی مرحوم جنکا ذکر آگے آچکا ہے یہ حضرت مولانا محمد فصیح بانیِ سلسلہ فصیحی کے صاحبزادے تھے۔ (غنی صاحب کے ایک اور بھائی مولانا محمد امانت اللہ صاحب مشہور واعظ گذرے ہیں جو میرے والد[له] مغفور کے بڑے محترم دوستوں میں تھے۔ اور وہ جب گیا میں تشریف لاتے تھے تو میرے مہمان ہوتے تھے۔ افسوس انکا بھی وصال

[له] مولوی صاحب نے خود انکے انتقال کی تاریخ لکھی ہے جو سر مزار موجود ہے ؎

اے غنی مصرع تاریخ سر قبر نویس　　بسوئے ملک عدم ہمنفس و ہمدم رفت

اسم گرامی اُن کا منشی بندہ علی تھا وہ گیا کے سربرآوردہ رئیس اور وکیل تھے انہوں نے اپنی عمر کا سارا حصہ اہل اللہ کی خدمت اور زیارت میں گذارا۔

ہو گیا اب انکی ممتاز اولاد میں خان بہادر شمس العلما مولانا ابوالخیر صاحب ریاست
گوالیار میں ہیں) مختصر یہ کہ یہ حضرات صاحب سجادہ ہیں اور چونکہ مومن کی بی بی
خود ناصری سجادہ اور خواجہ میر درد کے گھرانے کی تھیں نیز مومن خانصاحب خود
سادات علوی سے تھے اسلئے ان مرحومہ کی شادی غازی پور میں ہوئی۔ مومن کی
انہیں صاحبزادی کی اولاد میں ناصر حبیب صاحب وکیل ہیں۔ لو اب مومن کے نواسے
کا حال سنو۔

ناصر صاحب ننہال میں یعنی دہلی میں پیدا ہوئے نشو و نما ضلع سیتاپور اودھ میں پائی
علوم عربی و فارسیہ کے ماہر ہیں۔ انگریزی بھی جانتے ہیں وجاہت ظاہری یہ کہ آپ اک
نامی وکیل ہیں۔ اور بڑی بات تو یہ کہ ماہر فن شاعر ہیں۔ اور آج خاندان مومن کے واحد
چشم و چراغ ہیں۔ جب گوالیار کی آب و ہوا آپکے موافق نہ ہوئی تو آپ نے ریاست دتیا کو
ممتاز فرمایا۔ جو بالکل کور دہ ہے چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ ؎

کون ہے آگاہ میری قدر و قیمت سے یہاں   ایک گنج مایہ ہوں لیکن دبا ہوں زمیں میں

ناصر صاحب کا حلیہ مبارک ملاحظہ ہو۔
گورا رنگ۔ سڈول اعضا۔ خاندانی انداز کے موجب بہت کشیدہ قامت و جثہ
سفید نورانی داڑھی۔ سادے کپڑوں سے شوق ہے۔
آپکی شادی بھی ناصر وزیر صاحب سجادہ نشین خواجہ میر درد کی لڑکی سے ہوئی۔ اولاد
میں صرف دو صاحبزادیاں ہیں جنمیں سے ایک جنکا نام کنیز فاطمہ بیگم ہے راقم آثم کو
بھائی بھتیجی ہیں۔ اور حالات خاندانی سے سرفراز فرماتی رہی ہیں کیونکہ بوجہ
پیری ناصر صاحب نے لکھنا پڑھنا بند کر دیا صحت بھی خراب ہے اور عمر بھی (۹۶) بیاسی
سال کی ہو گئی۔ منظر خیرآبادی کی حیات تک مشغلہ انکی شاعری کا تھا انکی وفات
کے بعد یہ شغل بھی جاتا رہا سچ ہے ؏ مزا اس زندگانی کا بہار دوستاں تک ہے۔

فراق صاحب کا شکریہ جنہوں نے آجتک ایسے باخبر شخص کا پتہ تک نہ دیا ؎

لیا ہے عرشِ معلّٰی پہ شور نالوں کا   خدا بھلا کرے آلٰہ دینے والوں کا

میں دست بدعا ہوں کہ حضرت مولانا ناصر تا ابد زندہ سلامت رہیں مگر افسوس کے ساتھ یہ شکایت ہے کہ احوالِ مومن سے آجتک بے خبر رہے۔

کلامِ ناصر نواسۂ مومن۔

کیفِ چشمِ مست سے چھائی ہے ایسی بیخودی   بے پیے مدہوش ہوں ہر وقت میخانے میں ہوں

سب کو گردش ہے مری تقدیر کو گردش نہیں   دو نہ عالم میں ہمیشہ ایک پیمانے میں ہوں

زبان ملاحظہ ہو۔

دیکھ کر ناصر کی صورت بزم میں کہنے لگے   سایہ سا پیچھے پڑا ہے دور ہوتا ہی نہیں

زمین ہے مدعی اپنی عدو ہے آسماں اپنا   بسر ہوگی کہاں اپنی گذر ہوگا کہاں اپنا

یوں نکالی حسرتِ دل عالمِ خاموش میں   لے لیا میرے تصور نے انہیں آغوش میں

کون کہتا ہے شبِ ہجر نے سونے نہ دیا   طالعِ خفتہ نے بیدار ہی ہونے نہ دیا

المدد جوشِ جنوں موسمِ گل آپہونچا   آج زنجیر گرانبار کے ٹکڑے کر دے

لکھنؤ کے ایک پامال زمین میں مضمون کی بہار دیکھیے۔

چھپایا جان دیکر راز تیرے جورِ پنہاں کا   کیا ہمنے رگِ جاں سے رفو چاکِ گریباں کا

ہماری تیرہ بختی دیکھکر کیا کیا کٹر ہی جی میں   ذرا سا منہ نکل آیا ستارا کر شامِ ہجراں کا

تجھے دھوکا ہے میری خاکِ دامنگیر کیا منے   لیا ہے ناتوانی سے سہارا تیرے داماں کا

خاندانی سجادگی کا اثر ملاحظہ ہو ؎

ہوش ہی میرے اُڑ گئے عقل بھی میری کھو گئی   جب سے وہ شکل دیکھ لی آئینہ مجاز میں

یہ چند شعر عہدِ شباب کے ہیں۔ جب مضطر اور اُنکا دوستانہ تھا۔ یہ وہی مضطر ہیں جو امیر کی شاگردی سے منکر ہو گئے تھے اور گوالیار میں جج تھے۔

اداکے۔ نازکے۔ اندازکے۔ کرشمے کے
جُدا جُدا مرے سینے میں ہیں نشاں باقی

شباب آتے ہی بچپن پہ اُنکے لوٹ گئیں
رہی سہی تھی جو بچپن کی شوخیاں باقی

جو تیر آتا ہے اُنکا وہ ڈھونڈھتا ہے یہی
کہ دردِ عشق سے دلمیں کہاں کہاں باقی

رباعی

کیونکر یہ کہوں کسی سے اچھا ہوں میں
میں آپ سمجھتا ہوں کہ جیسا ہوں میں

لیکن مجھے کیوں نہ فخر ہو اے ناصر
جب حضرتِ مومن کا نواسا ہوں میں

دیوان انکا عرصہ سے تیار ہے مگر مذاق دنیا کا بدل گیا کیا چھپوائیں۔ آج مومن کا کوئی قدردان نہیں اُنکے نواسے کا کیا ذکر۔ پرانے گلدستوں میں بھی کلام آپکا ہے مومن کے اک اور عزیز۔ ع عرش

تیرے منہ میں ہے زبانِ مومن
تجھے روشن ہے بیانِ مومن

مرحبا صلِ علے کیا کہنا
تجھ میں پاتا ہوں میں شانِ مومن

دنیائے ادب کے فضا میں مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی۔ بی۔ اے۔ رجسٹرار ہائی کورٹ حیدرآباد کو کون نہیں جانتا ہے۔ اور دلی میں اس پایہ کا ادیب کون ہے۔ مومن خانصاحب سے آپکا بھی رشتہ ہے یعنی مومن آپکی دادی صاحبہ کے بھائی تھے۔ آپکو غالب کے خاندان سے بھی تعلق ہے۔ جیسے کہ آپکے جادو نگار قلم سے ۱۲۶۱ء میں دہلی کا ایک مشاعرہ۔ رسالہ اُردو دکن میں نکلا ہے۔ اور مضامین فرحت نام ایک کتاب بھی چھپی ہے نیز تصویر مومن سے اک عالم کو ممنون کیا ہے ہندوستان میں انکا ڈنکا بج رہا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اور محسن الملک آج ہوتے تو پتہ چلتا خیر یہ کہتے ہیں کہ مجکو فنِ شعر سے تعلق نہیں صرف نثر لکھ لیتا ہوں مگر میں نہیں مان سکتا ع

رہ پر انکو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائینگے دو چار ملاقاتوں میں

خاکسار عرش نے کلیات اپنا ریویو کیلئے حضرت کی خدمت میں بھیجا تھا اور لکھا

کہ آپ مومن کی بہترین یادگار دیں اسکو بنظر اصلاح دیکھئے اور اپنی رائے سے مطلع کیجئے چنانچہ اُسکی یہ رسید ہے۔

حیدرآباد دکن ۴ اوسمبر سنہ ۱۹۲۸ء

"آپکا دیوان میں نے دیکھا اور اچھی طرح دیکھا۔ میں نہ تو شاعر ہوں نہ سخن فہم۔ دہلی کا رہنے والا ہوں اسلئے زبان کا لطف اُٹھا سکتا ہوں۔ آپکے خط اور دیوان کی جو زبان ہے اگر یہی زبان بہار اور بنگالہ میں بولی جاتی ہے تو دہلی اور لکھنؤ والوں کو ذرا سوچ سمجھکر زباندانی کا دعویٰ کرنا چاہیئے واقعی آپ لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں ہاں اچھا ہے قدردان[۱] نہیں "

مارچ سنہ ۱۹۲۹ میں عرش کا سفرِ دہلی

اب کہاں شوکت و شانِ دہلی — مٹ گیا نام و نشانِ دہلی

نکلتے جاڑوں کے دن ہیں۔ دوپہر سے پہلے دھوپ میں گرمی آجاتی ہے ہپت چہار شنبہ ۲ کو شام کے وقت کوئی پانچ بجے ہونگے میں اسٹیشن نئی دہلی سے اُتر کے قطب کو جارہا ہوں اس سفر میں میرے عزیز میاں محمد کریم اور میر اطہر کا صلاح الدین احمد عروج[۲]

---

[۱] پیر و مرشد سے اب کہاں تسلیم اگلی شاعری ۔ مر مٹے وہ لوگ تھی جنکے لئے آپ جو کچھ رقم فرماتے ہیں دل ٹہرلاتے ہیں ورنہ میں آپکے بزرگوں اور آپکا کفش بردار ہوں۔ رہی قدردانی اسکے لئے دربار داری شرط ہے جو مومن کیطرح میرے حصے میں نہیں آئی بفضلہ دیوان میرا امراکی مدح سے پاک ہے خدا آپکو زندہ سلامت رکھے بہت جی خوش ہوا حالی ہے ملکر مگر ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جو رہا نہیں۔ لیجئے آج حیات مومن جسکا عرصے سے ہملوگوں میں چرچا تھا حاضر ہے ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے سب اُسکی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

[۲] خاکسار عرش کے اس لڑکے کی عمر اٹھارہ سال کی ہے مگر طبیعت موزوں رکھتا ہے یہ اشعار اسکے ہیں

دامن بچا کے رہنا آئے نہ داغ کوئی — یہ خاکدانِ عالم کاجل کی کوٹھری ہے
سیرِ بہارِ قدرت کر تو خزاں میں غافل — پتے ہیں خشک لیکن شاخِ چمن ہری ہے

بھی شامل ہے۔ ایک یہہ تصور ہے کے جتنا پورا ہو یہ پرانی دلی کے ٹوٹے ہوئے سے ملکے کچھ مومن کے حالات معلوم کروں۔ لو غروب آفتاب سے پہلے درگاہ شریف میں آگیا چونکہ بعد مغرب آستانہ شریف بند ہوجاتا ہے۔ اسلئے تازہ وضو کے ساتھ پہلے جانشین ہندالولی۔ یعنی حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار اقدس پر حاضر ہوا۔ اور فاتحہ پڑھنے کے بعد نماز مغرب اور ضروری کاموں سے فرصت پائی اب سہانی رات ہے اور خاموش چاندنی چپ چاپ در گور بنکر بیکسوں کے مزاروں پر پڑی ہوئی ہے۔ میں سماع خانہ میں لیٹا ہوا سوچ رہا ہوں کے خدایا وہ کیا مبارک وقت تھا، اور وہ کیسے مبارک بندے تھے جنکی روحانی قوت نے اسلام کو پھیلایا اور اس درخت کی جڑکو مضبوط کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آنکھ لگ گئی اور سو گیا جانیں وہ کیسی نیند تھی کہ ایک ہی کروٹ میں صبح ہوگئی اور اذان کی آواز کانوں میں آئی۔ اٹھ بیٹھا ضروریات اور نماز سے فرصت پاکے پہلے حضرت مولانا فخرؒ پھر قطب صاحب کے مزار اقدس پر حاضر ہوا۔ اور ان کے بعد حضرت مولانا عبد الحقؒ اور اولیا مسجد حوض شمسی۔ حضرت نجیب الدین فردوسیؒ (کہ مخدوم الملک بہاری کے پیر تھے) وغیرہ کے مزارات پر ہوکے قطب مینار کی طرف چلا گیا نیز مقبرہ شمس الدین التمش میں کچھ دیر ٹھہرا اور اس بادشاہ کو قطب صاحب کے خلیفہ ہونے کے سبب ایک عارفانہ نگاہ سے دیکھتا اور یاد کرتا رہا اللہ اللہ اس شخص کا یہ رتبہ تھا کہ اسنے نماز حضرت کے جنازہ کی پڑھائی تھی۔ اور آپکی کفش برداری کو فخر جانتا تھا۔

حافظ اینجا بہ ادب باش کہ سلطان و ملک همه در بندگی حضرت درویشان است

غرض تین دن قیام خاکسار کا یہاں رہا پرانی دلی کی گلیوں کی خوب خاک چھانی ایک شخص بھی نہ ملا جسکو علم ادب سے دلچسپی ہو یا مومن کے نام تک سے آشنا ہو۔ افسوس مردان تمام شدند و ملک خدا اخر گرفت۔ آخر طبیعت گھبرا گئی۔ اور وہاں سے نکل پڑا شاہ نظام الدینؒ اور حضرت امیر خسرو کی زیارت سے مشرف ہوتا ہوا غالب کے اجڑے مزار پر آنسو بہاتا ہوا۔

مقبرہ ہمایوں آٹھرا۔ اس مقبرہ کا اندرونی حصہ آگے صاف کرایا گیا تھا اب پھر میلا ہو گیا ہے اور
جانے آنے کے قابل نہیں ہے یہاں ہی طبیعت کو وحشت ہوئی اور اب سیدھا مہدیوں
میں مزارِ مومن پر آیا۔ ٹھیک انکے مزار کے پائینتی ایک نیا مزار بن گیا ہے جس پر یہ کتبہ ہے
(حاجی عبدالعزیز بعمر ۷۰ سال ۱۴ ذیقعدہ ۱۳۴۲ھ یوم چہارشنبہ بوقت فجر رحلت نمود)
اسکے دیکھنے سے مجھے تشویش ہے کہ اب مومن کے خام مزار پر بھی کسی اور کی قبر نہ بن جائے
آہ کیا کروں۔ انکے عزیزوں کو ابھی تک توجہ نہیں مجھے پہلے اس تاریخ کی پڑی ہے چھپ
لے تو ادھر رخ کروں مگر ؎

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

غرض مومن کے مزار پر فاتحہ پڑھنے اور آنسو بہانے کے بعد میں فتحپوری کے اک ہوٹل
میں چلا آیا۔ دوسرے دن آہی مرحوم کے پھوپھی زاد بھائی میر جمال الدین صاحب
مالک آئیرن ورکس دہلی۔ سے ملنے کو چوڑی والان میں گیا وہاں پہنچ چلا کہ قرول
باغ میں اجمل خانی طبیہ کالج کے آلات کے نمایش کا جلسہ ہے۔ وہ ہی وہیں گئے
ہوئے ہیں۔ میر صاحب آگے ہندوستانی دواخانہ دہلی کے منیجر بھی تھے۔ غرض
بڑی پریشانی کے بعد وہاں پہنچا۔ دوپہر ہو گئی ہے دھوپ کی شدت
اور پریشانیوں کے سبب تشنگی غالب ہے۔ قرول باغ کے گرد صحرائے
وحشتناک میں ہر بگولہ دیو سا نظر آرہا ہے۔ پتے ہوائے گرم کے ساتھ سایہ کی تلاش میں
ادہر اُدہر دوڑتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ مگر بیت جھڑ کے سبب درخت خود لٹے ہوئے مسافر
کے طرح خالی ہاتھ کھڑے ہیں۔ پناہ کون دے۔ قرول باغ کی نادر عمارت نہیں ڈھونڈتا
ہوا مہمان خانہ کے طرف نکل گیا وہاں میر صاحب قبلہ ملے ضعیف و ناتوان۔ گورے
آدمی۔ مختصر سی سفید داڑھی۔ کھدر کی شیروانی۔ اور گاندھی جی کی ایجاد کردہ
ٹوپی تھی۔ یہ مجھ دور افتادہ کیساتھ بہت خاطر سے پیش آئے کھانا بھی کھلایا اور برف کا پانی

بھی پلایا۔ مگر چونکہ مصروف تھے اسلئے باتیں نہ کرسکے دوسرے دن پھر اسکو اُٹھا رکھا ہیں اُنکے حکم کے بموجب دریاگنج کے کارخانہ میں شام کو گیا وہ مجھے مومن خانصاحب کی پوتی عزیز بیگم صاحبہ کے پاس کوچہ چیلاں میں لائے۔ پردہ کرایا گیا۔ عزیز بیگم صاحبہ نے میری خدمتوں کا حال سنکر بہت کچھ شکریہ ادا کیا میں نے اپنا دیوان اور رسالہ نگار جس میں مومن کی تصویر تھی اُنکی خدمت میں پیش کیا۔ وہ اپنے جد بزرگوار کی تصویر کو دیکھ کے رونے لگیں آزاد کی حق تلفیوں پر اظہار نفرت کرتے ہوئے تاریخ مومن کو جابجا سنا او بہت خوش ہوئیں۔ پھر یہ کہا کہ جو حق ہملوگوں کا تھا وہ آپنے ادا فرمایا خیر خدا آپکو جزائے خیر دے۔ مزار مومن کی درستی کا ذکر آیا فرمانے لگیں کہ اخراجات کا انتظام کر دیجئے میں بنوا دونگی۔ پھر اپنی پریشانیوں اور فراق صاحب کا حال فرمانے لگیں یہ بھی کہا کہ میرے پاس جو کچھ نانہالی جائداد ضلع شاہآباد آرہ میں تھی اور جسکو لوگ لوٹ رہے تھے۔ اسکو تنگ آکے میں نے بیچ ڈالا۔ پھر اسپر اظہار افسوس فرمایا کہ آپ ایسے موقع پہ تشریف لائے ہیں ہمارے بھائی موجود نہیں ہیں۔ بہرحال کم سے کم ایک وقت آپ روٹی ہمارے یہاں کھائیں۔

میں نے دست بستہ عرض کیا کہ اب وقت نہیں کہ میں زیادہ دلّی میں ٹھہروں۔ ورنہ عذر نہ تھا اس کے بعد چند دریافت طلب باتیں کیں جنکا ذکر جابجا تذکرہ میں کیا گیا ہے میر جمال الدین صاحب بھی اخیر وقت تک از راہ کرم باوجود مصروفیت میرے ساتھ رہے۔ ہر چند مجھے یہ علم ہوا کہ فراق صاحب اچھے ہیں بیمار نہیں مگر انکی دلخراش تحریر نے محروم ملاقات رکھا۔ دوسرے دن بیخود صاحب کے طرف گیا وہاں بھی مومن خاں صاحب کا ذکر رہا۔ وہ افسوس کے ساتھ یہ فرماتے رہے کہ میں نے کیا میرے والد نے بھی جو زندہ ہیں انکو نہیں دیکھا۔ بہرحال بیخود صاحب تواضع تکریم سے پیش آئے اور اپنے یہ اشعار بھی سنائے جو حوالہ قلم کرتا ہوں

بیخود صاحب بہ لحاظ عمر و صحت اب چراغ سحری ہیں۔ اور انکے بعد دلی یقیناً خالی ہوجائیگی۔

کلامِ بیخود

میری تربت میں نکیرین نہ آنے پائیں — کل بھی تکلیف ذرا لے شبِ ہجراں کرنا
زباں ہو داغ کی بیخود تو ہو مضمون مومن کا — بیاں غالب کا ہو اشعار کی وہ شان پیدا کر

اس صحبت کے بعد او ر چند حضرات سے بہ سلسلۂ تاریخ مومن ملا۔ اور اس کے بعد میں آستانہ حضرت مولانا شاہ محمد فاق رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے پیر تھے اور مجلو اسی سلسلہ میں بیعت ہی چلا آیا۔ اور حضرت شاہ سعید الزبیر صاحب مدظلہ کی صحبت سے سبزی منڈی میں فیضیاب ہوا

اور اسکے بعد دہلی کو نگاہ حسرت سے دیکھ کے روانہ ہوگیا ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

دلی کی نہ اب وہ شان ہے نہ زبان ہے۔ وضع تک بدل گئی اخلاق تک بدل گیا صرف چند پرانے گھرانے ہیں بس اُنہیں کے دم تک اور ضعیف العمر بیگموں کی حیات تک دلی دلی ہے چنانچہ ہم سے بہت پہلے داغ نے ہی اسکا فیصلہ کر دیا ہے ؎

پھر بھی پہلے اُڑاتی تھے زبانِ دہلی — لے گئے لوٹ کے سب شوکت شانِ دہلی

عزیز بیگم صاحبہ کی زبان بہت پاکیزہ اور صاف ہے انکے خطوط بھی اکثر آیا کرتے ہیں، و باللہ التوفیق۔

تنقیدِ کلامِ مومن

زمانہ قدیم سے گرچہ یہ اصول چلا آرہا ہے کہ ایک شاعر کا کلام دوسرے کے سامنے لا کے یہ کہلایا جائے کہ کون کس سے بڑھا ہوا ہے تو

فقیر عرش حضرت عاشق علی عرف مستان شاہ صاحب مدظلہ مکمل پوش خلیفہ حضرت مولانا فضل رحمٰن کا مرید ہوں عمر شریف انکی تقریباً نوے سال کی ہوگی تجرد اور سیاحی میں ہمیشہ بسر فرماتے ہیں۔ ذکر قلبی ہر وقت انکے قلب پاک سے جاری ہے۔

میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس سے کوئی نتیجہ بجز جنگ اور تعصب کے نہیں نکلتا بلکہ اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ شعرا کے دقیق کلام کی تشریح کی جائے کہ وہ عام فہم ہونے کے قابل ہوں۔

بھلا تردد بیجا سے اُسمیں کیا حاصل   اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

بالفرض کہ مومن خان۔ خاقانی۔ ظہوری۔ انوری سب سے بہتر تھے تو اس سے کیا ہوا کریں۔ سوال تو یہ ہے کہ اُنکا کلام میرے سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ اسلئے ہمنے تنقید کے طرف زیادہ رخ نہ کیا بلکہ تشریح کلام مومن کی طرف رخ کیا۔ اور اُس معاملہ میں بھی نکتہ چینیوں سے یہ التماس ہے کہ وہ بعوض اسکے کے میری رائے پر تردید پیش کریں از راہِ کرم اپنی ذاتی محنت سے کام لیں دُنیا کو اختیار ہے وہ جسکو پسند کرے۔ وقت ضایع کرنے اور اخبارات میں مضامین لکھنے سے تو میرے خیال میں بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بہرحال اب میں اُس بلند پایہ شاعر کے کلام کی تشریح اور اختصار کے ساتھہ تنقید شروع کرتا ہوں کہ تذکرہ میں تا بہ امکان کوئی کمی رہ نہ جائے۔

قصاید۔

چونکہ جناب ضیا بدایونی نے مومن کے قصاید کلیات سے علیحدہ کرکے چھپوائے ہیں اور جابجا تشریح بھی کی ہے اسلئے مجکو اسکے طرف زیادہ رخ کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ دوسرے آج قصاید کی قدردانی دنیا میں کہاں ہے کہ میں چند صفحات سیاہ بھی کروں اور لوگ اُسکو دیکھیں۔

وہ دن گئے کہ رباعی پہ اشرفی پاؤں   کہ اب قصیدے پہ ملتا ہے ایک چھدام نہیں۔

بہرحال پھر بھی میں اسکے طرف رخ کرتا ہوں کہ اس مذاق والوں کو بھی گونہ دلچسپی ہو۔

سوداؔ بہترین قصیدہ گو اُردو کے تھے اور اُنکے بعد ذوقؔ کا نمبر ہے۔ ان لوگوں نے زور شور طبیعت کا جو اس فن میں دکہایا اُسکا سبب یہ تہا کہ قصیدہ گوئی اُنکا ذریعہ معاش تہا۔ مومن کے قصاید اگر اُنکے مقابلے میں کم رتبہ ٹہراے بہی جائیں تو یہ سمجھ لینا ہوگا کہ مومن نے ایک بازی شطرنج کی نہ کہیلی کوئی قصیدہ لکھ لیا، پھر یہ بھی کہ علمی خصوصیتیں جہانتک کہ اِنکے قصاید میں ہیں وہ سوداؔ۔ و ذوقؔ یا کسی اور کو نصیب نہیں۔ بعض قصاید میں انکی عالمانہ و فاضلانہ شان اُن عربی ٹکڑوں سے اور بہی ظاہر ہوتی ہے جسکے قریب تک بجز انشاؔ کوئی اُردو کا شاعر نہیں گیا۔ ان تمامی معاملات کو مدّ نظر رکھ کے انکی بے طلبی کو نگاہِ قدر سے دیکھ کے یہ ماننا پڑیگا کہ یہ اپنے عہد کے عرفیؔ۔ انوریؔ، فردوسیؔ ضرور تھے۔

قصیدہ در حمدِ باری تعالےٰ

۱ الحمد لواہب العطایا	اس شور نے کیا مزا چکہایا
۲ والشکر لصانع البریّہ	جسنے ہمیں آدمی بنایا
۳ احسان ہیں اوسکے کیا گرانبار	سرِ شیخ شداد کا جہکایا
۴ کیا پایۂ منّتِ سلیمان	اک بات میں تخت پر بٹہایا

۱ یعنی لفظی سے تو صرف کام چلنے کا نہیں اسلئے مطلب سے کام لیتا ہوں ؎

میرے شعروں میں کہاں معنیِ لفظی تسلیم　　یہ تو کیفیتِ دل ہے کہ بیان ہوتی ہے

اس شعر میں صرف عطا جان ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تعریف اُس بخشش کرنے والے کی نہیں ہوسکتی۔ اور اُسکے عطاؤں کے شور نے وہ مزا چکہا رکہا ہے کہ کچھ دل ہی جانتا ہے، سچ تو یہ ہے کہ انسان کی اک حقیقت ہستی اُسکی عطاؤں سے مالامال ہوئی، اور اِنہیں عطاؤں کے بدولت اُسکو خطاؤں سے بہی نجات ہوئی، دوسرا پہلو یہ بہی ہے کہ اگر انسان میں خطا مضمر نہوتی تو اُسکی عطائیں جلوہ گر نہوتیں ؎

موقوف جرم ہی پر عطا کا ظہور تھا　　　بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا

خداوندِ عالم نے قرآن پاک کو الحمد کے لفظ سے شروع فرمایا ہے اسلئے بھی انھوں نے اُسی لفظ سے اُسکی حمد شروع کی ہے۔ دوسرے مصرعے میں نمک کے مقابلے میں مزا کا لفظ عجب مزا دے رہا ہے اور شعرا اس صنعت کو مراعاۃ النظیر کہتے ہیں۔

۲ ہزار شکر اُس صانع حقیقی کا (جسکی ذات ہر شکل و صنعت سے مبرا ہے) کہ اُسنے بجائے وحوش وطیور کے مجکو انسان بنایا اور اس ذریعہ سے اُسنے میرے مراتب کو فرشتوں سے بھی زیادہ بلند کیا۔ یعنی ؎

بنایا آدمی کو ذوق ایک جزو ضعیف　　　اور اُس ضعیف سے کُل کام دو جہاں کے لئے

۳ احسان اور اُسکا احسان کوئی معمولی وزن نہیں رکھتا کہ آدمی اُسکو سر پر اُٹھا لے۔ دیکھو آسمانوں کو جنپر اُسکی عطیہ رفعت کا احسان ہے اور یہ اسی کی گرانباری ہے جسنے اُنکے سروں کو جھکا رکھا ہے، اور ہر گوشہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خاک پہ سر بسجود ہو رہا ہے۔

۴ یہ شعر معنی کے لحاظ سے کچھ بھی نہیں مگر مطلب کے لحاظ سے بہت بلند ہے مگر جب تک تم ان دو باتوں کو نہ جانوگے۔ نہ مانوگے۔ سلیمان کون تھے۔ تخت سلیمان کی حقیقت کیا تھی جواب ۱ حضرت سلیمان ایک میرے ہی جیسے انسان پیدا ہوئے تھے۔ مگر اُنکو خداوندِ عالم نے پیغمبری عطا کی اور اس پایہ کی پیغمبری عطا کی کہ وہ انسان کُل جانوران آبی و دشتی کی بولی سمجھتے تھے۔ جن و پری و شیاطین تک اُنکے تابع تھے۔ اُنکو سلطنت وہ بخشی کہ جسکے مطبخ میں غلہ تو غلہ ستّر ہزار اونٹ پر روزانہ نمک آتا تھا اور خرچ ہو جاتا تھا۔ خیال کرو کہ کتنی مخلوق روز کھانا کھاتی ہوگی۔

۲ اب تخت کی حقیقت سنو کہ ہر بادشاہ روئے زمین کو اُس شہنشاہ دوجہاں نے صرف اتنا بڑا تخت دیا کہ وہ عافیت کے ساتھ بیٹھ سکے انکو وہ تخت دیا جسپر بارہ ہزار نبی اسرائیل

بیٹھتے تھے۔ اور ہوا کے دم پر ایک روز میں ایک مہینہ کی راہ طے کرتا تھا۔
اب مطلب کی طرف آسانی سے تم خود جھک سکتے ہو۔ کہ ان عطیات کے ساتھ جنکا ذکر آ چکا جو ہما اور ہدہد اور عالم نے اک بات میں یعنی یکسر لمحہ میں ایسے تخت پر انکو بیٹھا دیا اسکے مقابلہ میں سلیمان علیہ السلام کا شکر یہ یعنی زانو ہنکا یا کوئی چیز ہے۔ ع

سبحان اللہ چہ نکتہ دانیست یک حرف طلسم صد معانیست

دنیا کے بابصیرت نقادِ فن اگر اسی طرح تشریح کلام مومن فرما دیں تو میرے خیال میں اس تنقید سے جسکا کہ ذکر کر چکا ہوں کہیں بہتر ہے۔

قصیدہ در نعت سرورِ کائنات

اے محرمِ خلوتی کہ آنجا محو است نشانِ آفرینش

نعت کا قصیدہ جو مومن نے لکھا ہے اسکی تمہید بہاریہ ہے۔ اسکے دو شعروں پر بہتر کا اکتفا کرتا ہوں۔

ا ز ہے ترتیب صفا خاک بیز ہی گلچیں پڑے جو عکسِ گلزار میں گلوں کے عکوس
۲ ہجوم سبزہ نے کی بسکہ رنگ آمیزی زمین پہ چادرِ مہتاب بن گئی ہے سدوس

ترتیبِ صفا۔ اور خاک بیز۔ انہیں دو لفظوں پر شعر کا وجود قائم ہے خبر میں اپنے مطلب سے مطلب رکھتا ہوں۔ یعنی آگے لکھ چکا ہوں کہ ڈکشنری لکھنے نہیں بیٹھا۔ مطلب کو بیان کر کے شعر کا حُسن دکھلانا میرا کام ہے۔ وہ سنو۔ کہتے ہیں کہ زمین گلشن کچھ اسقدر صاف اور شفاف ہے کہ اوس پر آئینہ کا گمان ہے اب جو وہ آئینہ ہے تو گلہائے باغ کا عکس بھی اُس پر پڑ رہا ہے۔ جب عکس بھی پڑ رہا ہے تو گلچیں ترتیب صفا کے دھوکے میں اسکے اصل پھولوں کے طرف تو ہاتھ نہیں بڑھاتا ہے۔ زمین پر عکس کے طرف ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ آئے سبحان اللہ سبحان اللہ۔ کیا صفائی چمن کی تعریف ناظرین نے اس سے بھی اچھی کبھی

شنی۔ ایسا لطیف پیرایہ بھی اُنہے کہیں نظر آیا۔ نہیں اور ہرگز نہیں۔
ہجوم سبزہ شومن خانی انداز ہے جسکو کسی اور نے کا ہیکو پایا ہوگا۔ سدوس
سبز چادر کو کہتے ہیں اب مطلب سنو۔ سبزہ کی کثرت نے اُس چادر نور کو جو سفید
چاندنی کے طرح چمن میں بچھی ہوئی تھی اپنے پرتوے ہرا کر دیا ہے۔ اور اب
چاند تو سفید ہے مگر چاندنی سبز ہے جسطرح شمع جلا کے کوئی شمعدان پر سبز
کنول رکھہ دے تو شمع کی تو اپنی صورت یہ رہتی ہے مگر سفید چاندنی کا فرش
سبز ہو جاتا ہے وہی عالم چمن کا شب کو نظر آرہا ہے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔
اب اُمرا کی شان میں جو قصاید لکھے گئے اُنہیں سے بھی دو چار شعروں کو ملاحظہ فرمائیے

قصیدہ در مدح والئے پٹیالہ

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری — کثرتِ دُود سے سیہ شعلۂ شمع خاوری
فیل نشیں بنا دیا خاک نشین کو اُسنے اب — خاک نہیں فلک کو زیب لاف گزاف برتری
لینے ہوئے گرے جو بار عطا سے لعل و دُر — کلبۂ خاکروب ہو جیسے دوکانِ جوہری

یہ مطلع اُنکے ان حاسدوں کے طرف مخاطب ہے جو اس انعام فیل پر رشک کر رہے تھے۔
وہ یہ کہتے ہیں کہ بھئی اگر صبح ہوگی تو اُس سے کیا میری تیرہ اختری یعنی قسمت کے
ستارے کی تاریکی تو بدستور رہے۔ اور تاریکی کا ہیکو دھواں کھو جسنے آفتاب کے
شعلہ کو بھی گھیر کے سیاہ کر رکھا ہے اور اب اُسکی شعاعوں کا کہیں نشان بھی
نہیں ہے۔ اک نکتہ خاص اور بھی ہے کہ انعام میں اگر زر و جواہر ملتا تو اُمید
ہوتی کہ قسمت کا ستارہ اک روز چمکیگا۔ ہاتھی کا رنگ چونکہ سیاہ ہے
اسلیئے اس انعام سے بھی تیرہ اختری کا فال نکلتا ہے۔
مجھہ خاکنشین کو ممدوح نے فیل نشین بنا دیا یہ عنایت اُسکی ہیں ایسی صورت
میں اب میرے آگے فلک کا دعوائے برتری فضول ہے۔ معلوم ہوتا ہے

کہ اول اول جب یہ ہاتھی پر بٹھائے گئے ہیں تو آسمان کی طرف دیکھ کے یہی شعر کہا ہے۔ اب مکان چلے جا رہے ہیں اور انگلیوں کی کنگھی زلفوں میں کرتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ

خاک نہیں فلک کو زیب لاف و گزاف برتری

حاسد جل رہے ہیں اور تماشائی گرے پڑتے ہیں۔ لگا ولے خاک نشیں اور فیل نشیں کی ترکیب پر حیران ہیں۔؟

بادشاہوں یا امیروں کی داد و دہش کی تعریف تو کرنے والوں نے ضرور کی ہے مگر مومن اپنی جدت کے سبب کسی کی تقلید کیوں کریں۔ وہ کہتے ہیں کہ ممدوح اگر سائل کی مٹھیوں کو لعل اور موتی سے بھر دے اور انعام لینے والے کی مٹھی میں اسکی سمائی نہ ہو سکے یہاں تک کہ کچھ گر بھی پڑے یا وہ گرا دے اور انکو چنکر خاکروب لے جائے اور اپنے جھونپڑے میں رکھ دے تو اسکا تنگ سا مکان بطور خود دوکان جوہری ہو جائے۔ اب قیاس کرو کہ گرے پڑے مال سے جب وہ اتنا مالدار ہو جائے تو وہ شخص جسکو یہ انعام ہو کسقدر متمول بن سکتا ہے

عنوان تاریخ گوئی

جان کہیا کے آزاد نے ایک تذکرہ لکھا تو یہ بھی سمجھ لیا کہ ہم خود خاقانیِ ہند ہو گئے خدا کی شان یہاں لوگوں نے عمر گذار دی اور یہی کہتے رہے ؎

ابھی سے کیا کریں دعوائے شاعری تسلیم
یہ کام وہ ہے کہ جو عمر بھر نہیں آتا

اب آزاد صاحب کی سخندانی ملاحظہ ہو کہ تعمیہ اور تخرجہ تاریخیں عیب میں داخل ہیں یعنی ضائع و بدایع ہیں و انکا شمار نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مومن کو بارت گذر گئی آخری دور کے شعرا میں امیر تک سے کہ ایک ماہر فن اوستاد تھے اسکو اختیار کیا ہے وہ داغ کے دیوان پر لکھتے ہیں کہ ع شاعر نکالیں حوصلے مہتاب داغ سے یعنی مہتاب داغ سے اگر حوصلہ کے اعداد نکال لو تو تاریخ طبع نکل آتی ہے۔

بہر حال میں عرض کر آیا ہوں کہ مومن ہمیشہ راہ عام سے الگ رہے اسلئے بہ
بالقصد اُنہوں نے ان کوچوں میں قدم رکھا جہاں ہر شخص کا گذر نہیں اس
مشکل فن میں وہ وہ کمالات دکھائے کہ ذوق کیا غالب تک کی وہاں رسائی نہیں ہے
مومن نے اپنے والد کی تاریخ انتقال لکھی ہے

به ملهمِ الهام گذشت سالِ وفات   که غلامِ نبی بحق پیوست

یہ تعمیہ ہے یعنی غلام نبی میں حق کے اعداد کو ملا دو تو سال نکل آئیگا۔
اپنی لڑکی کی تاریخ لکھی ہے

نال کٹنے کے ساتھ مومن نے   کہی تاریخ دختر مومن

یعنی دختر مومن سے نال کے اعداد نکال لو تو تاریخ ولادت نکل آتی ہے
اسی طرح ایک کنوئیں کی تاریخ لکھی ہے۔ ع آب لذت فزا بہ جام بگیر
آب لذت فزا کو جام میں ڈال دو تو ۱۲۶۵ھ نکل آئیگا تخرجہ میں اک ورندہ یکساں انہوں نے
اپنے اُستاد علامہ شاہ عبد العزیز کے وصال کی تاریخ میں دکھایا ہے یعنی ؎

دست بیدادِ اجل سے بے سروپا ہوگئے   فقر و دین فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

اہمیں یہ صنعت عجیب ہے کہ مصرع ثانی میں جتنے الفاظ ہیں اُنکے اول و آخر کے
حرفوں کو گراتے ہوئے چلے جاؤ۔ بیچ کے حرفوں سے سال نکل آئیگا۔ جیسے فقر
لفظ ہے اسکے ق۔ اور ر۔ کو گرا دو صرف ق کو رہنے دو وقس علی ہذا
غالباً دنیا کے پردے میں اسکی نظیر دشوار ہے اور اگر مومن کے بعد کسی نے ایسی
تاریخ لکھی تو تتبع ہے۔
آزاد جو یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ سادی تاریخوں پر قادر نہ تھے یہ بھی آشفتہ
بیانی ہے رمل اور نجوم کا جاننے والا علم حساب میں کمزور نہیں ہو سکتا خیر
سادی تاریخوں کو دیکھو۔

خلیل خاں کی ختنہ کی تاریخ لکھی ہے سنت خلیل اللہ۔

اپنے عمّہ مرحومہ کی تاریخ فرمائی ہے۔ لہا اجراً عظیم۔

اپنے والد کی اک اور تاریخ لکھی ہے۔ فازنا زفوزاً عظیماً۔

کالے صاحب کے مرنے کی تاریخ لکھی ہے ع کالے صاحب کو سرخرو پایا۔

مولانا محمد عمر صاحب کے مرنے کی تاریخ ہے۔

مجھے سالِ تاریخ کا تھا خیال کہ سب نے کہا مرگ شیخ زماں

معمہ اور پہیلی۔

اس میں حضرت امیر خسرو کے ہم عنان ہیں۔ غرض کسی فن میں بند نہ تھے۔

معمہ مہتاب رائے

بنے کیونکر کہ ہے سب کار اُلٹا ہم اُلٹے بات اُلٹی یار اُلٹا

ہم۔ بات۔ یار ان تینوں الفاظ کو اُلٹ دو تو مہتاب رائے کا نام بطنِ مصرع سے پیدا ہو جاتا ہے۔

گھنٹے کی پہیلی

نہ بولے وہ جب تک نہ کوئی بلائے نہ لفظ اور معنے سمجھ میں کچھ آئے

نہیں چور۔ پر وہ لٹکتا رہے ٹک ٹک زمانہ کا احوال بکتا رہے ٹک

شب و روز غوغا مچایا کرے اسی طرح سے مار کھایا کرے

تخمیس

یہ بھی خاص انکے حصہ کی چیز ہے دوسرے کے شعر کو اپنا کر لینا یہ اسکی صفت ہے

قدسی کے شعر پر انکے مصرعے ہیں۔

ہوئی انجیل کہاں ناسخ و توریت و زبور تیری خاطر سے خدا نے یہ نکالا دستور

ہے رعایت تیری ہر بات کی کتنی منظور ذات پاکِ تو در یں ملکِ عرب کردہ ظہور

زاں سبب آمدہ قرآن بہ زبان عربی

قطعہ۔

اس میں چسپیدگی۔ روزمرہ۔ اور زبان کی بہار دیکھیے۔

زانوئے بُت پہ جان دی۔ دیکھا؟ مومن انجام و اختتام مرا

بندگی کام آ ہی آخر کو میں نہ کہتا تھا کیوں؟ سلام مرا

مثنوی۔

اسکا انداز مومن کے تعشق کی بحث میں دکھا چکا ہوں۔ دوبارہ ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ہاں بعض معترضین کا جواب دینا جنہوں نے چھوٹا منہ اور بڑی بات کہی ہو ضرور ہے۔ یعنی وہ لکھتے ہیں کہ یہ مثنویاں عُریانی اقوال سے بھری ہوتی ہیں۔ اور انکا اثر اخلاق پر اچھا نہیں پڑ سکتا۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ مثنوی خواب خیال مصنفہ میر اثر برادر خواجہ میر درد یا ان مثنویوں سے بھی زیادہ خراب ہیں جن کے اشعار میں یہ مصرع بھی داخل ہے کہ ع ساری کھٹیا لہولہان ہوئی۔

(فیصلہ) مثنوی عیق مصنف نے اقوالِ خاص میں لکھی ہے۔ دوسری مثنویاں جنھیں اپنے کو مخاطب تو کیا ہے مگر واقعی زمانہ کے شوقینوں اور نوجوانوں کے حالات سے وابستہ ہیں کیونکہ مومن کو کسی مورخ نے آوارہ روزگار نہیں لکھا اور ایسی صورت میں تم سمجھو کہ نہ سمجھو مگر وہ عشق کا ڈرامہ بجز خیالی ہے نتیجہ سے خالی نہیں نیز اُن کے دامنِ اتقا پر تمہارے لگائے داغ نہیں لگ سکتا۔ مومن کی ان مثنویوں تک جذباتِ عشق مجازی کو مدنظر رکھ کے میر حسن کی مثنوی جسمیں خلافِ یقین دیو اور پری کے قصے ہیں۔ ہرگز نہیں پہونچ سکی۔

ہاں اندازِ بیاں اسکا نہایت مرغوب ہے۔ اور ترکیب کی الجھنوں سے پاک مگر یہ دور انگریزی نہیں ہے

ایک اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ مومن نے عشقیہ مثنویوں میں پھر اپنے کو مخاطب کیوں
کیا اسکا جواب میرے پاس اسی قدر ہے یعنی ؎

حق تو یوں ہے کہ عجب لوگ ہیں مردانِ خدا — اپنے سر غیر کی ناحق یہ بلا لیتے ہیں

مومن کی بعض مثنوی مذہبی جوش بھری ہوئی ہے جسکو نام کے مسلمان پسند نہیں کر سکتے ہیں بلکہ وہ جو ہر وقت راہِ حق میں اپنا سر لئے کھڑے ہیں پسند کرینگے۔ دیکھو کس جوش میں لکھتے ہیں اور جہاد و شہادت کے کیسے تمنائی ہیں ؎

کوئی جرعہ دے دین فزا جام کا — کہ آجائے بس نشہ اسلام کا
برنگِ مے ایمان کو آجائے جوش — نہ اپنا رہے اور نہ دنیا کا ہوش
یہی اب تو کچھ لگ گیا ہے خیال — کہ گردن کشوں کو کروں پائمال

یہی جذبات حضرت سید احمد صاحب بریلوی میں بھی تھے۔

رباعیات۔

اسکے اندر تشریح طلب کوئی بات نظر نہیں آتی اسلئے بطور یادگار کچھ رباعیاں لکھے دیتا ہوں۔ یہ اُسی انداز کی ہیں جب کہ انکے عہد کے اساتذہ نے لکھیں ہاں رنگ یہ اپنا ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

جورِ معشوق

شوخی تھی زبس میرے ستانے کیلئے — گرمی تھی یہ آگ پر لٹانے کیلئے
دشمن پہ نگاہِ سرد مہری کے سبب — تم آگ ہوئے میرے جلانے کیلئے

عقیدتِ شاہِ شہدا

روشن ہے جو ہے آلِ عبا کا پایہ — ہاں مرتبہ تسلیم و رضا کا پایہ
قندیل ہے عرش کی جو ہر جانِ شہید — کیا ہوئیگا شاہِ شہدا کا پایہ

مرثیہ زندگانی

ہے عہدِ شباب زندگانی کا مزا　　پیری میں کہاں وہ نوجوانی کا مزا
اب یہ بھی کوئی دن میں فسانہ ہوگا　　باتوں میں جو باقی ہے کہانی کا مزا

اسمیں شک نہیں کہ میر انیس مرحوم نے پیری کی رباعیاں خوب خوب لکھیں اور اُنکے خاندان والوں کی ذات پہ یہ چیز ختم ہوگئی مگر اوپر کی رباعی اسوقت کی ہے جب مومن کے پاس اس بام تک پہونچنے کو کوئی زینہ نہ تھا۔

واسوخت۔

یہ بھی انکے عہد کی کوئی نئی چیز نہ تھی۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ اوروں نے اس چاٹ کو بازاری رنگ میں رنگا اور انہوں نے اسکو خونِ جگر میں ڈبویا ہے۔ یعنی وہی لکھا جو اپنے پر گذری۔

دیکھو اس بند میں کیا کیا طعنے یہ معشوق کو دے رہے ہیں اور وہ ہمہ تن گوش سر جھکائے ہوئے شرم سے عرق عرق ہے۔

میں ہی تو رہا ہوں کہیں شب کو خوش وخرم　　میں نے ہی تو کی بادہ کشی غیر سے باہم
میری ہی نظر سے ہے عیاں نیند کا عالم　　آتی ہی جمائی پہ جمائی مجھے ہر دم
انگڑائیاں لیتا ہوں یہ لب میں ہی تو پیہم　　میری ہی تو گردن میں پڑا جاتا ہے یہ خم
میری ہی تو آنکھوں میں غضب نیند بھری ہے
میری ہی جبیں ہے کہ جو گھٹنے سے لگی ہے

اس تصویر کے دیکھنے کے بعد یہ ماننا پڑیگا کہ گو معاملہ کی صورت تو ایک ہے مگر یہ نیچرل انداز انکے عہد و قبیل کے اساتذہ نہ دکھا سکے۔

کلامِ فارسی۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں غدر کے بعد فارسی ہندوستان کے پردے سے گویا اُٹھ گئی ہی نہیں بلکہ جو غور کرو تو قبل غدر بھی توجہ اسپر نہ تھی خاص طور پر مومن خاں نے

آدمی تھے جو اپنی بزم میں بیٹھ کے روز گا لیتے تھے۔ غالب جنکا دعویٰ ہے کہ اصل مذاق میرا فارسی ہے اُنکی صحبتوں کا بھی یہی حال تھا کہ مہینے میں ایک آدھ بار فارسی کے مذاق والے جمع ہو کے فارسی غزلیں پڑھ لیتے تھے۔ آج تو اسکا ذکر ہی بیکار ہے۔ مگر جب تک قیامت نہیں آتی ہے اُس وقت تک جو شے عالم ایجاد میں آچکی ہے مٹ مٹا کے بھی ضرور رہیگی اسلئے جو چند بوڑھے اس مذاق کے باقی ہیں اُنکو کیوں محروم کہوں مومن کا فارسی کلام بصورت دیوان موجود ہے اُسکو پڑھ کے اہل ذوق جھگڑ لیں اور نقادان فن لڑ لیں کہ اُن کا کیا پایہ تھا میں اسیقدر کہے جاتا ہوں کہ زور کلام اور جوش بیان جو مومن کا اُردو میں ہے وہی فارسی میں ہے۔ زبان میں انکی قدرت اور خیال میں ندرت ہے۔ لو چند اشعار سن لو۔

نتاب رشک ملایک بہ دوزخ اندازند	تو بر جنازۂ مومن اگر نماز کنی کو

میں آگے عرض کر چکا ہوں کہ مومن کا رنگ فارسی میں بھی اپنے حال پر قائم ہے۔ دیکھیے اس شعر میں بھی تمنّاہائے پنہاں اور رشک کا تماشہ پیدا موجود ہے۔

چساں بہ نالہ ام گوشے نہد بپرد میرا	تمناہائے پنہاں را شکایتہائے پیدا را
خوش نیست دور چرخ و مہ آفتاب را	از سر نہاد جہان خراب را کو
امشب عسس زکوئے تو ام چون برد کہ دوش	فریاد من نہ دیدہ شد و نبرد خواب را
جائے رحم است بر آن بسمل مسکین کہ ہنوز	نیم جانش بہ تپش باشد و قاتل برود

وہ بسمل بیکس واجب الرحم ہے جسکی جان ابھی تک ہنوز نہیں نکلی اور قاتل اخفائے خون کے لیے اسکی لاش کو کسی جگہ چھپانے یا دفن کر دینے کو مقتل سے لئے چلا جاتا ہے اتنا بھی انتظار نہیں کہ جان تو نکل لے۔ یہاں قاتل کی بے دردی اور بسمل کی بیکسی قابل لحاظ ہے۔

ہم تاب وصل غیرت من بے نصیب	خود دشمن خودم نشناسم رقیب را

گفتہ چنیں کسے سروکار سے فتنہ ترا — ناصح برگِ من کہ چہ تدبیر می کنی
مومن چہ کافری کہ بایں طالعِ زبوں — کارِ مرا حوالہ بہ تقدیر می کنی ہوئی
بر و بر و طرفِ کوئے مدعی کیں را — ہزار بار غلط کردہ و باز کنی۔
زبان بہ طعنۂ دشمن کشادہ ام۔ دائم — بایں دہن نتوانی کہ شرح راز کنی۔

قصیدہ فارسی جو زمین عرفی میں ہے۔ نیز تواریخ و رباعیات فارسی وغیرہ کو اسلئے قلم انداز کرتا ہوں کہ ذوق معدوم ہے۔ ع ہر سخن موقع و ہر نقطہ مقامی دارد

مرثیۂ معشوق۔

صنفِ شاعری میں یہ ایک نئی چیز ہے جو مومن عالم وجود میں لائے۔ ورنہ معشوق کا مرنا گو نیچر کے مطابق ہے مگر کون مانتا ہے۔ رشک مرحوم نے ایک شعر لکھا تھا جس پر لکھنؤ والے منہ آتے تھے اور کہتے تھے کہ معشوق کا برا چیتنا رشک کا کام ہے ؎

بھیک مانگے گا ہر ایک دریا ہو گو تم اگر — کشتیِ ملاح کجکولِ گدا ہو جائیگی

بہر حال جب موت ہر شخص کیلئے لازمی ہے تو کیا معنی کہ ہم مرجائیں اور ہمارا لوطرا معشوق قیامت تک چشمِ نابینا سے آنسو بہایا کرے۔

خیر ان مرثیوں کی صورت میرے ایمان میں وہی ہے جسکو میں آگے لکھ آیا ہوں جذباتِ عشق اور دردانگیزی ان شعروں کی ملاحظہ ہو جو خود واقعہ جانکاہ کا پتہ دیتی ہے ؎

اُنکو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گذری
دوست جو ساتھ مرے تا لبِ ساحل آئے

دل کیطرح سے یہ بھی چلی جان کو کیا ہوا — دم میں نہیں ہے دم مری جانان کو کیا ہوا
(دبہ خمی کنگھی جسکو عام طور پر عورتیں ہی استعمال کرتی ہیں اسکا نقشہ ملاحظہ ہو)

سر پٹکتا ہے شانہ پڑا دونوں ہاتھ سے — کیا جانے اسکی زلف پریشاں کو کیا ہوا
پیتی ہے اپنا خونِ دل افسوس سے حنا — اُس دستِ رشکِ پنجۂ مژگاں کو کیا ہوا

(ذیل کے شعر میں شرمندہ سازِ مہرِ درخشاں کی اچھوتی ترکیب ملاحظہ ہو)

شبنم کو پھر ہے جانبِ خورشید التفات — شرمندہ سازِ مہرِ درخشاں کو کیا ہوا
دلمیں شکن ہے زلفِ مسلسل کدھر گئی — برہم ہے حال کاکلِ پیچاں کو کیا ہوا
بوئے قبائے یوسفِ گل ہے نسیم میں — اُسکی شمیم عطرِ گریباں کو کیا ہوا

(لذت فزا اور زخم بے مزا کی جدتوں کو دیکھئے)

لذت فزا الم نہیں اُس لب پہ کیا بنی — کچھ زخم بیمزہ ہیں نمکداں کو کیا ہوا
گردش پہ اپنی ناز ہے پھر روزگار کو — اُس چشمِ رشکِ فتنۂ دوراں کو کیا ہوا
دعویٰ ہے شوخیوں کا غزالانِ دشت کو — اُس خوش نظر کی جنبشِ مژگاں کو کیا ہوا

عیب و حجاب شمع رخاں جہاں گیا
وہ مہرِ آسمانِ نکوئی کہاں گیا

کھودی خزاں نے رونقِ گلزار ہائے ہائے — پژمردہ ہو گئے گلِ رخسار ہائے ہائے
پھرتی نہ تھی جو پردہ نشیں گھر میں بے حجاب — نعش اُسکی جائے ہے سرِ بازار ہائے ہائے
سروِ فتادہ قامتِ محشر خرام ہے — کیا ہو گئی وہ شوخیِ رفتار ہائے ہائے
اے چرخ یا کشش تجھے پاسِ وفا نہیں — میں اور رنج و وحشت و آزار ہائے ہائے

نظارہ ہے محرکِ ماتم ہزار حیف
ابرو ہوا ہلالِ محرم ہزار حیف

اندازِ تغزل —

بہارِ بیخزاں ایسی نہیں کوئی چمن کہتا — خدا جو فکرِ رنگیں دیتے یہ گلزار پیدا کر

تغزل کا انکے انداز یہ کہ اشعار انکے مضامین پیچیدہ سے نازک خیالوں اور نادر

ترکیبوں کے ساتھ درد و غم سے معمور ہیں ایک ہی لفظ کو متواتر لاتے ہیں اور معنے عجیب و دلکش پیدا کر دیتے ہیں بہترے شعر ایسے بھی ہیں جو بالکل سہل ممتنع ہیں اور عام دماغوں کی وہاں تک رسائی نہیں یہی سبب ہوا کہ کلام انکا خاص پسند رہا اور ہے۔ مگر مجھے اپنی تشریحات سے یقین ہے کہ اگر اسی طرح اور اہل قلم بھی متوجہ ہوئے تو مقبولیت عام رکھی ہوئی ہے۔ ابتداً غالب کی شاعری کا بھی یہی حال تھا۔ خیر ؎

نالۂ بلبلِ شیدا تو سنا ہنس ہنس کر — اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

لو میں چند شعروں کو بطور نمونہ پیش کر دیتا ہوں۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہ وہی شعر ہے جس پر غالب سینے پہ ہاتھ رکھ کے شب بھر ٹہلتے رہ گئے اور یہی کہا کہ اے کاش خانصاحب اپنا یہ شعر دے دیں اور مجھسے دیوان لے لیں۔ اس شعر کو تصور کی معراج حاصل ہے ہر چند غالب نے بھی لکھا ہے کہ ؎

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن — بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

یعنے مجھسے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرے اپنے رنگ اور اپنی محویت میں رہنے دو۔ مومن کہتے ہیں کہ بھئی مجھے تو عرصہ ہوا وہ منزل حاصل ہو چکی تھی اب تو تصور کے اُس مقام پر ہوں کہ جب میرے پاس کوئی دوسرا نہیں رہتا ہے تو تمہیں تم ہوتے ہو اور اسطرح ہوتے ہو کہ جیسے کوئی ہمکلام ہو۔ اے سبحان اللہ سبحان اللہ گویا کے لفظ نے اس شعر کو آسمانِ ہفتم پر پہونچا دیا ہے۔ اور تصور کو آجتک کسی شاعر نے ایسا بیان نہیں کیا۔ اسلئے خالی یہی ایک شعر مومن کے مقدر کا فیصلہ کرنے کو بس ہے

"لو" اے بتو سُنو کہ وہ مومن خدا پرست — مسجد میں آج جا کے مسلمان ہو گیا

کیا اُلٹی بات ہے کہ مومن جب خدا پرست تھا ہی تو کافروں کیطرح خصوصیت کے

ساتھ مسجد میں جا کے مسلمان پھر کا ہے کو ہوا۔ صرف مومن ہی دلیل اسکے مسلمان ہونے کی تھی۔ پھر یہ کہ خدا پرست ہی تھا۔ مزا یہ بھی ہے کہ کوئی قاموسی لفظ نہیں جس کے معنے بتاؤں۔

اب مجھ سے سنو۔ الصلوٰۃ نور۔ یعنی نماز کی وہ روشنی ہے کہ شرق سے غرب تک عالم کو منور کر دیتی ہے اور درمیان میں کوئی پردہ از حجاب عظمت تا بہ تحت الثریٰ باقی نہیں رکھتی۔ (مگر یہ صلوٰۃ معراج المومنین ہے نہ کہ ہمارے ایسے پراگندہ روزگار کی نماز کہ مسجد میں بھی بیٹھے بیٹھے کعبے کو کٹھے کا طواف کر آتے ہیں) یہاں مومن بتوں کو متوجہ کر کے کہتے ہیں کہ اب وہ تمہارے دام میں کیا پھنسیگا جب تک وہ کوچہ عشق مجازی میں تھا اُسکا ایمان بالغیب تھا اور خدا پرستی ہی یقین کے درجہ میں پہونچکر نہیں کرتا تھا۔ لو آج اُس نے جا کر مسجد میں نماز پڑھ لی ایمان اُسکا عین الیقین کے درجہ پر اسوجہ سے پہونچ گیا کہ بے حجاب اُس نے جلوہ حقیقت کا مشاہدہ کر لیا۔ اور آج مسلمان اور حق شناس ہو گیا۔

ایسا شعر وہی کہہ سکتا ہے جو عالم باخبر اور صاحب طریقت ہو۔ جب تک مسجد میں مومن نہ جاتے (اور مسجد میں آدمی اسی لئے جاتا ہے کہ نماز پڑھے) اور نماز نہ پڑھتے ایمان بالغیب ہی رہتا۔ اور مجازی سے حقیقی میں کسطرح آدمی پہونچتا ہے وہ یہ نہ سمجھتے۔

قطع اُمید سے سر کٹنے کو کیا نسبت | مجھ میں ہر دم ابھی تیرے خنجر میں نہیں

مومن جذبات ذوق کے جوش میں یہ کہتے ہیں کہ اگر وصل کے طرف سے قطع اُمید ہو گئی تو اسکے یہ معنے ہیں کہ ہمت ہار کے خودکشی کر لوں۔ اپنا سر آپ کاٹ ڈالوں لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ میں ہمت مردانہ رکھتا ہوں۔ اس مٹی ہوئی حالت پر بھی مجھ میں

وہ دم ہے جو ابھی تیرے خنجر میں نہیں ہے۔ وہ اور ہیں جو مایوسیوں سے تنگ آ کے خودکشی کر لیتے ہیں یہاں تو سر ہے اور تیغِ رضا ہے ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را | ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

نہ مانونگا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا | کہ ہر ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

یہ میرا وعدہ ہے یہ میرے اختیار کی بات ہے میں ناصح کی نصیحت کو نہ مانونگا مگر یہ جو آپ شکایت فرماتے ہیں کہ تو اُسکی نصیحت سننے کیوں گیا تو بے ادبی معاف مجھے تو یہ عرض کرنا ہے کہ میں اُسکی باتیں سننے پر معذور و مجبور تھا کیونکہ وہ ان تذکرہ میں وہ بار بار جناب کا نام لیتا تھا پھر کیسے ممکن تھا کہ جہاں آپکا نام آئے وہاں میں نہ ہوں اور اُسکو میں نہ سنوں۔ خانصاحب کی ان چھچلی باتوں میں بڑا مزا آتا ہے اور سچ ہے کہ آدمی شعر کہنے کو کہہ سکتا ہے مگر یہ نہیں لکھ سکتا ہے۔ اس فن میں عمر گذار دی مگر یہ نہ آیا اور اب کیا آئے گا ؎

رُک رُک کے دم پھر ہی دم آنے کو کیا کہیے | جینے کا یہ عالم ہے مر جانے کو کیا کہیے

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس | آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

یعنی تقدیر تو ایسی پائی کہ تو بھی بھلی۔ اب اُس پر اختر شناسی اور علم نجوم ٹھہرہ ہے یعنی جو ہوئی اُمید وصل پر بھی جو زندہ رہتا تو نہیں رہ سکتا اسلئے کہ جب اپنی کمال یاسی کو دیکھتا ہوں تو دل پکار اُٹھتا ہے کہ ؎

ایک نجومی داغ سے کہتا تھا آج | آپ کے دن اب جناب اچھے نہیں

اب تو مر جانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو | ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اُٹھا جائے ہے

غدر سے پہلے کی زبان ہے مگر اسکی مٹھاس میں آجتک شہد اور مصری کا مزا ملتا ہے اب شعر کی نزاکت سنو وہ فرماتے ہیں کہ مرنے کے لئے دنیا سے اُٹھنا شرط ہے مگر یہاں تو ضعف سے اُٹھنے کے قابل ہی نہیں رہا ہے پھر مروں کسطرح۔ اب ایک قیامت

ہنر قیامت کبرای بھی آئے تو میں ہوں اور میری زندگی۔

کیا کیجئے کہ طاقت نظارہ ہی نہیں　　　جتنے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں

لیجئے ضعف نے طاقتِ نظارہ زایل کر دی۔ اور اُسنے جب یہ دیکھا کہ عاشق کی آنکھ دیکھنے کی ہیں تو بے حجاب ہو گیا۔ اب جتنا وہ بے حجاب ہے ہم اُسی قدر اپنے ذوقِ دید سے شرمندہ ہیں۔ یا یوں کہو کہ تجلّی رخِ یار سے آنکھوں میں خیرگی ہے۔ آفتاب بے نقاب ہے تو کیسے اب جو کثرتِ نور سے آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو اُسکو اپنے حُسن کی گرمیوں کے دکھانے کا اور بھی موقع ملتا ہے اور میں جب کوششِ پیہم پر بھی ناکامیاب رہتا ہوں۔ تو ندامت سے عرق عرق ہو جاتا ہوں مومن اسکے سامنے آکے جلوہ نما ہونے کو لکھتے ہیں غالب یہ کہتے ہیں ٹھٹی کی آڑ میں شکار فضول ہے

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز　　　آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

غرض مومن ہوں کہ غالب دونوں بیک وقت دو راستوں سے چلتے ہیں مگر جب منزل پر پہونچتے ہیں تو ایک ہی درخت کے سایہ میں بیٹھ کے یہ باتیں کرتے ہیں کہ میر و سودا کے بعد ہمیں دو شخص دہلی کے نام کی بقا کو کافی ہیں۔

کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں　　　مجکو فکرِ جواب نے مارا

کیوں صاحب یہ آپ پوچھتے ہیں جو مجھے جانتا ہو بتلائیے تو سہی کہ اس سوال کا جواب کیا دوں۔ اگر یہ کہوں کہ آپ پر مرتا ہوں تو کیا آپ اسکو مانینگے ہرگز نہ مانینگے مضحکہ میں جی ہاں کہکے اُڑا دینگے۔ لیجئے میرے پُرانے دوست غالب آگئے بھئی تم بڑے فلسفی مشہور ہو۔ رند ہو۔ یہ ہو۔ وہ ہو۔ غرض سب کچھ ہو بتاؤ تو سہی اس سوال کا کیا جواب ہے۔ اور کیا جواب دوں۔ لو صاحب یہ تو کہتے ہیں میں تمہارے پاس خود اسی لیئے آیا ہوں۔ کہ اپنے مرض کا علاج کراؤں اور نسخہ پوچھوں خدا بخشے مولوی فضلِ حق کی رنڈی جسنے عرصہ تک ہماری آن بان دیکھی۔ ہماری

جوانی دیکھی۔ میرا نکھرا ہوا چہپنی سنگ دیکھا۔ اب جوادھر نزلہ سے دو چار بال پک گئے اور میں نے سر ہی منڈوا ڈالا۔ تو آج انجان بنکے ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے ۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

(غالب کا اگر زور چلتا تو وہ بعوض پوچھتے ہیں کے پوچھتی ہے لکھتے)
خیر اب تو غالباً میرے بیان کی تصدیق ہو گئی ہو گی کہ مومن کے مقابلہ میں اگر کوئی لایا جا سکتا ہے۔
تو غالب ۔

جب ہو گیا یقین کہ نہیں طاقتِ وصال ۔ دم میں ہمارے وہ ستم ایجاد آگیا

یعنی جب معشوقہ کو یقین ہو گیا کہ مومن میں طاقتِ دید نہ رہی۔ تو مغالطہ میں آ کے اسکے گھر چلا آیا اور جب چلا آیا تو طاقت وصال پر برملا و بے حجابانہ کہتا ہے کہ ؎

زور وزر جبکہ کچھ نہ تھا لے تمیر ۔ کس توقع پہ آشنائی کی

اب ہمت مردانہ سے کام لیکے مومن ڈٹ جاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ دم میں آگئے۔ واہ کہیں غالب صاحب بھی اسی کمرے کے ایک کونہ سے لگے کھڑے تھے فرمانے لگے کہ بھئی کیا کہوں ؎

کہتے ہیں جب مجھے نہ رہی طاقتِ سخن ۔ جانوں کسی کا حال میں کیونکر کہے بغیر

جب یہ سنا تو مومن کے معشوق نے جھلّا کے کہا کہ ہٹ یہ سب تیرے بوڑھے چوچلے ہیں اب میں کبھی تم دونوں کی بات پر یقین نہ کرونگا دونوں جھوٹے ہو۔
تنقید اور تشریح کی بہار دکھاتے ہوئے اب میں ناظرین کو اُس صحرا میں لاتا ہوں جہاں دو عظیم الشان پہاڑ آپس میں ٹکرا رہے ہیں ؎ مومن

وقتِ جوشِ بحر گریہ میں جو محوِ نالہ تھا ۔ حلقۂ گرداب ہر اک شعلۂ جوالہ تھا

غالب فرماتے ہیں کہ ؎

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا — شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

بتلائیے ہمرنگی اور ہم آہنگی کی کوئی حد بھی۔ وہی انداز پھر دیکھئے۔

مومن سے

رشکِ پیغام ہے عنان کشِ دل — نامہ بر راہ بر نہ ہو جائے

غالب سے

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ — یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

مختصر یہ ہے کہ اگر فلسفۂ غالب بھی ہم رکابِ مومن ہوتا یا نازک خیالی مومن شریکِ غالب ہوتی تو دونوں اساتذہ کے کلام کا فرق نکالنا مشکل تھا بقول سے

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے — دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا — میں الزام اُنکو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

وہ کہتے ہیں کہ میں نے بہت امتحان تیرے جذبِ دل کا کیا اُس میں کوئی اثر نہ پایا اگر اثر ہوتا تو میں تیرے پاس پہونچ گیا ہوتا۔ اب جو تو میرے پاس انتظار کر کے چلا آیا ہے تو یہ میرے جذبِ دل کا سبب ہے جس نے تجھے کھینچ لیا۔ اب اسی حالت میں مجھ پر تیرا الزام ہی غلط بلکہ تیرا ذاتی قصور ہے (اس گفتگو کے بعد سمجھ سکیے کہ عاشق منفعل ہو کے خاموش ہو جائے اور کیا کر سکتا ہے۔)

ہوں کیوں نہ مجھے حیرتِ نیرنگیِ عشق — جو دل میں شعلہ تھا وہی آنکھوں سے نکلا آب تیرا

عشق کی نیرنگیوں پہ حیران ہوں۔ اگر دل میں محبت کی آگ نہ بھڑکی تو آنسو آنکھوں سے نہ نکلتے یہ وہی آگ ہے یہ وہی شعلہ ہے جسکو تم آنسو کے شکل میں پا رہے ہو کیا کیا منطق اور حکمت کے مسئلوں کو حل کیا ہے۔ سبحان اللہ۔

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں — اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

آواز کا وزن بظاہر کچھ نہیں معلوم ہوتا مگر جو ہے نہیں تو پھر شیشۂ دل پہ گالی

پتھر کا کام کیوں کرتی ہے۔ وہ معشوق کی نزاکت کے ساتھ اپنی نازکخیالیوں سے معشوق کے آواز کی نزاکت کو یوں سمجھاتے ہیں کہ اُسکا کوئی بار میرے قلب ضعیف پر نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اور نکتہ یہ ہے کہ واقعی عاشق کو معشوق کی گالی کچھ گراں نہیں ہوتی اسی کی دوسری صورت داغ نے دکھائی ہے کہ ع معشوق کی گالی سے کچھ عزت نہیں جاتی۔ مگر استغفر اللہ زمین آسمان کا فرق ہے۔

بجلی گری فغاں سے مری آسمان پر ۔۔۔ جو حادثہ کبھی نہوا تھا سو اب ہوا

دنیا سے بالکل الگ لکھا ہے۔ بجلی آسمان سے زمین پر گرتی ہے نہ کہ آسمان ہی پر چمکے اور اُسی پر گرے۔ اب ایک نازک اسرار قابل لحاظ ہے یعنی وہ بجلی نہیں ہے بلکہ فغاں کی بجلی ہے۔ اور خاصیت بجلی کی یہ ہے کہ جس پر گرے اُسکا خاتمہ کردے مومن یہ کہتے ہیں کہ میری فغاں اسقدر بلند ہے کہ وہ آسمان کے اوپر تک گئی اور چونکہ اوپر کے طرف جاتی ہے پلٹنا اُسکا لازم ہوا اسلئے وہ جو پلٹی تو آسمان کا خاتمہ کرتی ہوئی پلٹی۔ اور یہ وہ حادثہ ہوا جسکو کبھی اہل زمین نے دیکھا نہوگا۔

آغشتہ خوں دست کو پونچھتے ہیں وہ ۔۔۔ اُلٹے کف جلاد میں دامن ہو ہمارا

یہ بھی بالکل اچھوتا بیان ہے۔ مقتول کے ہاتھ میں از روئے قاعدہ جلاد کا دامن ہونا چاہئے یہاں جلاد کے ہاتھ میں مقتول کا دامن ہے وہ کسطرح کہ خون آلود ہاتھ کو جلاد مقتول کے دامن خون ناحق چھپانے کو پونچھ رہا ہے۔ مگر دنیا تو اس نکتہ کو نہیں سمجھ سکی اُسکا تو یہی خیال ہے کہ مقتول ہی خطاوار ہے جب ہی جلاد نے اُسکا دامن پکڑ رکھا ہے۔

ہٹ گیا ہے گاؤ دیہ سنگ سوتے میں کہیں ۔۔۔ شب یہاں رہنے کا تیرے سب میں چرچا ہوگیا

ہاں جناب حکیم صاحب یہ ضرور ہوا ورنہ وہ اگر دوپٹہ اوڑھے ہوئے پڑے رہتے تو کون جانتا کہ صاحب جی ہیں۔ آپ نے ہی اسکا خیال نہیں کیا۔ یہاں تک

آپ کے احباب کمرے میں آگئے اور اسکا چرچا بازار دشمن ہوگیا۔

شوخ کہتا ہے " بے حیا جانا — دیکھو دشمن نے تمکو کیا جانا

رقیب کمبخت بالکل بے شعور ہے۔ مردک سی پوچھو تو سہی کہ تمکو شوخ ہم کہتا ہے یعنی ہمعنی دیگر بے حیا بتاتا ہے کیونکہ جب شوخی بات میں غالب ہوجاتی ہے تو درمیان سے حیا اُٹھہ جاتی ہے۔ توبہ توبہ اس کم بخت کا ساتھہ چھوڑو۔ (یعنی کسیطرح ایسی نفرت دلاؤ کہ وہ میرے ہتے چڑھ جائیں)

چلمن کے بدلے مجکو زمین پر گرا دیا — اُس شوخ بیحجاب نے پردہ اُٹھا دیا

پھر وہی شوخ۔ نظر ہو اب یہ کیا کہ شوخی سے جو بیحجابی غالب آئی تو کمرے کا پردہ اُٹھا دیا اور بعوض اسکے کہ چلمن گرا رہنے کا موقع تھا اور ہم سامنے تھے پردہ اُٹھا دیا اس کا اُس نے کچھہ خیال نہ کیا یہاں تک کہ میں نے اُسکو دیکھہ لیا اور بے ہوش ہو کے گر پڑا۔ اب ترکیبوں کی الٹ پلٹ کو دیکھئے کہ ایک شعر کے اندر کتنی رعایتیں ہیں چلمن۔ حجاب۔ پردہ۔ پھر اُٹھانے کے مقابلہ میں گرانا۔ بس یہی وہ ترکیب ہے جو اور کے اختیار کی نہیں نہ اختیار کر سکتا ہے۔

مٹی نہ دی سزا تلک آ کی اُس پہ بھی — کہتے ہیں لوگ خاک میں اسنے ملا دیا

کیا کیا حسن بیان ہے۔ تیرے انداز کے صدقے۔ یعنی اسی بدنامی کے ڈر سے کہ احباب جو شریک جنازہ تھے اُسکو دیکھہ کے آوازہ کستے وہ میرے جنازہ پر نہ آیا یہاں تک کہ مٹی بھی نہ دی۔ اب سنو کہ ہٹہ دہرم اس پر بھی یہی کہتے ہیں کہ اُسی نے مومن کو خاک میں ملا دیا۔ جھوٹوں پر لعنت وہ تو خیریت ہوئی ورنہ اگر آکے مٹی دیتا تو جانیں دنیا کیا کیا کہتی۔ غرض مومن کی طبیعت وہ بحر ناپیدا کنار ہے جسمیں پانی کی دھاروں کے ساتھہ موتی بہتے نظر آتے ہیں جسکا جی چاہے دامن بھر لے مگر جو ذہن رسا کی کشتی کی دہاں تک رسائی بھی ہو۔ معشوق پر مٹی نہ دینے کا جرم ہے

اور پھر دعوی کرنے والا خود انکے طرف سے عذرِ معقول بھی پیش کر رہا ہے ؎

عجب اس عاشقی کا اُلٹا پلٹا کارخانہ ہے — ہمیں روٹھے ہیں اُنسے اور ہمیں انکو منانا ہے

جوشِ وحشت نے اٹھایا بالعرش کو — اپنے پاؤں سے گئے مدفن میں ہم

ہاں کیوں احسان کسی کا لیتے خدا میرے جوشِ وحشت کو قایم رکھے جو مرکر بھی باقی تھا اور اُسی کے طفیل میں کسی کے مرہونِ منت نہوتے اپنے پاؤں مدفن تک پہونچ گئے ۔

خنجر کو نہ توڑ سخت جانی — پھر کس کو گلے لگائینگے ہم

ارے اُن کا گلے لگانا تو عید تک نہیں معلوم اب اگر اے سخت جانی اونکے خنجر کو بھی تو توڑ ڈالیگی تو ہم گلے کسکو لگائینگے کمسے کم وہ نہ سہی انکا خنجر ہی سہی

آپ وہ ہوئے ملکِ محبت اس نہیں ہے ہمکو تو — ہوتے ہیں لاغر اور زیادہ جتنا ہم غم کھاتے ہیں

زبان اور درد انگیزی اسکی میر تقی مرحوم کی روح پاک کو پکار رہی ہے — مضمون مومن خاں کے انداز کا ہے آدمی کھانے پینے سے موٹا ہوتا ہی یہ اس غذا کو کھاتے ہیں جس سے روز بروز دبلے ہوتے جاتے ہیں ۔ اسی ترکیب میں یہ مضمون دیگر درد کا مطلع یاد آگیا ہے سُن لو ؎

عمر کیا روز بروز گھٹتی ہے — جتنا بڑھتی ہے اُتنا گھٹتی ہے

لاش پر آنے کی شہرت شبِ غم دیتے ہیں — لے پری ہم ملک الموت کو دم دیتے ہیں

شبِ غم موت آنا معلوم ۔ اور جب مرنا مقدر میں نہیں ہے تو ملک الموت صاحب بھی تشریف نہیں لانے کے ۔ اب جن وانس اور فرشتے تک انکے شیدائی اور مشتاقِ دید ہیں اسلئے یہ ترکیب نکالی ہے کہ میں اس امر کو غلط مشہور کردوں کہ میرے جنازہ پر اسنے آنے کا وعدہ کیا ہے اس بیچ میں ملک الموت جائینگے کہ میں بھی اُنکے دیدار سے ذرا مشرف ہو جاؤں تو جب ملک الموت آئینگے

تو پھر میری روح قبض کرنے پر بھی وہ مجبور ہونگے بغیر اسکے میں مرونگا کیسے اور جب
میں مرونگا نہیں تو وہ جنازہ پر آئینگے کیونکر اور جب وہ آئینگے نہیں تو ملک الموت
انکی زیارت سے مشرف کسطرح ہونگے۔ مختصر یہ ہے کہ منطقی بحثیں ہیں
جنجھیں ہیں پھر پیرایۂ بیان اسقدر پسندیدہ ہے کہ آدمی شعر سمجھے کہ نہ سمجھے داد دیئے
بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔

جانے دے چارہ گر شبِ ہجر انہیں مت بُلا — وہ کیوں شریک ہوں مرے حالِ تباہ میں
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را — میں تو بلاؤں میں گھرا ہوا دم توڑ ہی رہا ہوں

پھر اے چارہ گر انکو بلا کے میرے حالِ تباہ میں کیوں شریک کرتا ہے اسلئے کہ انکو پریشانی
اور افسردگی ہوگی اور اس افسردہ دلی سے میری انجمن افسردہ ہو جائیگی پھر آنا
نہ آنا برابر۔

تا نہ پڑے خلل کہیں آپکے خوابِ ناز میں — ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں
وہ یہ فرماتے ہیں کہ شبِ ہجر کی طوالت میں کمی ہو کہ نہ ہو ہم یہ نہیں چاہتے انکی خوابِ
ناز کا سلسلہ صبح ہو جانے کے سبب ٹوٹ جائے وہ سوئیں اور چین سے سوئیں۔ ہیں
ہم ایک دردمند دل خدا کے گھر سے لائے ہیں اپنی عافیت کیلئے دوسرے کو تکلیف
دینا اپنا مسلک نہیں۔

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا — جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں
مومن کے حسنِ بیان کے صدقے کس خوبصورتی سے معشوق کو غیر سے الگ رکھنا
چاہتے ہیں یعنی وہ کہتے ہیں کہ میرے دشمن سے اگر تمکو دوستی ہو تو اسکے طرف
نہ دیکھو کہ تمہاری نگاہ میں جادو بھرا ہوا ہے اُس پر یہ چل گیا تو مر جائیگا اور گرچہ
مجکو مسرت ہوگی مگر تمکو تو صدمہ ہوگا۔

کیا حضرتِ مومن کہیں کعبے کو سدھارے — سُنسان ہے گھر کسلئے کیوں آج ہی دن سے

وہ جیسے کعبے کے جانے والے ہیں مجھے معلوم ہے۔ صاحب کوئی بتاں میں ڈھونڈو وہیں کہیں ہونگے۔

شب وہ جو اپنی بزم میں آنکھیں چرا گئے کھوئے گئے ہم ایسا کہ اغیار پا گئے

وہی الٹی پلٹی ترکیبیں ہیں اور حسن ایسا پیدا ہو گیا ہے کہ سبحان اللہ سبحان اللہ وہ فرماتے ہیں کہ رات اپنی بزم میں جو اُسنے ہمیں چرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تو ہم کھو گئے اور اس کھو جانے یعنی بیہوشی کو اغیار پا گئے اور تاڑ گئے کہ یہ فیض دزدیدہ نگاہی کا ہے۔ چرانا۔ کھونا۔ پانا۔ معمولی الفاظ ہیں اور شعر اس قدر بلند ہے۔

غالب نے تتبع انکا کیا ہے اور خوب خوب کیا ہے انکا بھی شعر سنئے

لاکھوں بگاڑ ایک چرانا نگاہ کا لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

مگر

اُمید ہے لطفِ دوستاں سے کہ اتنا فرمائیں سب زباں سے

کیا ہے ناسخ نے آسمان سے بلند مرتبہ اس زمین کا

لفظوں کے ہیر پھیر کو مومن کے مقابلہ میں غالب کے اشعار میں اور بھی دکھاتا ہوں سنئے۔

مومن

بیمارِ اجل چارہ کو گر حضرتِ عیسےٰ اچھا بھی کرینگے تو کچھ اچھا نہ کرینگے

موئے نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہوا بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہوا

محو مجھ سا دمِ نظارۂ جاناں ہوگا آئینہ۔ آئینہ دیکھیگا تو حیراں ہوگا

نیا کرم نہ کروگے اگر ابرام نہوگا الزام سے حاصل بجز الزام نہوگا

غالب

دردِ منت کشِ دوا نہ ہُوا — میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
جان دی۔ دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یہی صورت لفظِ یعنی کی ہے۔ جس کا استعمال گو مومن سے پہلے کے اساتذہ میں بھی بڑے حُسن کے ساتھ میر وغیرہ نے کیا ہے مگر مومن نے اپنا رنگِ خاص میں اسکو داخل کر دیا ہے اور غالب نے اُنکا تتبع مناسب جانا ہے۔

مومن ؎

غمخانہ تنگ و تار ہے اور ہم سیاہ روز — جلتے ہیں یعنی۔ چاہیئے آٹھوں پہر چراغ
اظہارِ شوقِ شکوہ اثر اُس سے تھا عبث — یعنی کہا کہ مرتے ہیں تم پر۔ کہا عبث

رباعیِ غالب ؎

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے — وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لئے
یعنی ہر بار صورتِ کاغذ باد — ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کیلئے

اب ایک امر اور بھی عرض کرنا ہے کہ جب دوستوں نے مومن کو بھڑکایا تو انہوں نے یہ لکھا کہ ؎

مومن اُسی نے مجھ سے دی برتری کسیکو — جو پشت فہم میرے اشعار تک نہ پہونچا

جب غالب کو لوگوں نے اشتعال دیا تو وہ یہ کہہ اٹھے کہ ہاں ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اب جو میں نے اوپر اکثر جگہ یہ عرض کیا ہے کہ رنگِ مومن میں غالب کا لکھنا تتبع ہے یہ اسلئے لکھا کہ عہد تو دونو کا ایک سے ہے مگر مومن کی گذرگاہ بے نقش پائے خضر تھی اور وہ غدر سے پہلے چلے بھی گئے غالب کو مومن کا دیوان مطبوعہ انکے بعد ملا اور کافی موقع تتبع کا ملا اسلئے کہ اگر مومن کی آزاد طبیعت یہ چاہتی کہ غالب کا

تتبع کریں تو غالب کے فلسفہ اور تصوف کی شان اُنکے کلام میں بھی پائی جاتی مگر نہیں ہے اور غالب نے بزورِ قوتِ آورد تتبع کرنا چاہا تو اطمینان سے کیا اور کامیاب بھی ہُوئے۔ غالباً اس منصفانہ رائے سے اہلِ نظر اتفاق فرمائینگے۔ اور نہ مانیں تو میرا زور بھی نہیں۔ شما بخیر دبا بہ سلامت۔

جراح کیا سونچا تھا۔ کیا رنگ دیکھا۔ کیا ہُوا   کیوں کھول لی پٹی مرے زخمِ جگر سے باندھ کر

مطلب اسکا جو مولوی امتیاز احمد صاحب۔ بی۔ اے۔ نے لکھا اس سے بہتر مطلب تو کوئی بتا ہی نہیں سکتا یعنی جراح نے پٹی زخمِ جگر سے باندھی اور کھول لی۔ ظاہر ہے کہ پٹی باندھ کے کھول لینا کسی سبب پر مبنی ہوگا۔ مجروح۔ جراح کے اس فعل کو دیکھ کے سوال کر اُٹھتا ہے کہ جراح تو نے کیا سوچا تھا۔ مگر کوئی جواب نہیں ملتا۔ دوسرے سوال کی ضرورت پیش آتی ہے کہ کیا رنگ دیکھا۔ مگر جراح کی طرف سے خاموشی ہے زخمی پھر پوچھتا ہے کہ کیا ہوا۔ یہاں آکر مصرع ختم ہوگیا ہے اب جراح کا طرز دیکھئے مجروح کا پے درپے سوال کرنا (جو بیقراری کی علامت ہی) اس پر جراح کی خاموشی یہ مومن ہی سے بڑے شاعر کا کام تھا جو اتنی کامیابی کے ساتھ اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوا ہے۔

اب اس مطلب کے ضمن میں مجھے اسیقدر کھول کر کہہ دینا ہے کہ جراح نے اک معمولی زخمِ جان کے پٹی باندھ دی تھی۔ مگر جب اسکو پتہ چلا کہ یہ زخمِ جگر ہے اور جگر کا زخم اچھا نہیں ہوتا تو اس نے اسکو فعل لاطائل سمجھ کے اور علاج فضول جان کے پٹی ہٹا لی مگر مجروح کو اک وحشت سی ہوگئی ہے اور وہ یہ کہہ اُٹھتا ہے کہ ؎ آتش

عزیزوں کو دواسے جب کہ غش پڑھتا نظر آیا   مجھے تقدیر پر چھوڑا مری تدبیر کم کر دی

میں پھر بھی کہونگا اور ہزار بار کہونگا کہ بعوض تنقید کے اگر ایسے تشریح کرنے والے مومن کے نصیب سے پیدا ہوجائیں تو مومن کی حق تلفی کا عوض ہو سکتا ہے

کہتے ہیں تمکو ہوش نہیں اضطراب میں   سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

یعنی پہلے ہوش کی دوا کیجئے تب عرض حال کیجئے گا۔ اب اک بدحواس آدمی کے گلہ کا وزن کیا رہا اسی زمین میں غالب کی استادی سنئے کہ ؎

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں   میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

ان دونوں کے داخلی مضامین کے آگے ذوق کا بھی چراغ جلا دیتا ہوں گو روشنی نہیں پھیلتی ؎

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں   واں ایک خامشی مرے سب کے جواب میں

اب آپ ہی خدا لگتی کہئے کہ اس خارجی مضمون کا کوئی وزن ان مضامین کے سامنے نہیں ہے اور ہرگز نہیں مگر آپ اس پر بھی بیدار نہوں اور دن چڑھے تک سوتے رہیں تو میں بجز اسکے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ ؎

پہلو سے اٹھ کہ جلد سے وہ صبح ہو چکی   لیکن جناب عرش ابھی تک ہیں خواب میں

کر علاج جوشش وحشت چارہ گر   لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

اے طبیب تو علاج جوشش وحشت کرنے آیا ہے۔ ارے یہ جنون عشق ہے ایسے بیمار کا علاج یہی ہے کہ اگر کسی عطار کی دوکان میں صحرا بکتا ہو تو وہ خرید کے لادے کہ دیوانگی میں سکون ہو۔ ورنہ تو خود دیوانہ ہے کہیں عشق کے دیوانے کی دیوانگی بھی جا سکتی ہے۔

مرگ ہے انتہائے عشق یہاں ہے ابتدائے عشق   زندگی اپنی ہو گئی رنجش بار بار میں

زندگی اپنی ہو گئی کیا اچھی زبان ہے۔ کیا پیارا روزمرہ ہے یعنی زندگی ختم ہو گئی ابھی عشق کی ابتدا ہی تھی کہ ہم رنجش بار بار کی بدولت مر گئے ہیں تو اسکی انتہا کیا ہے اسکی خبر بھی نہیں۔

چرخ و زمین میں توبہ کا ملتا پتہ نہیں   ہنگامہ بہار و ہجوم سحاب میں

ہنگامہ بہار کی طرح ہجوم سحاب کی ترکیب بھی نہایت ہی پسندیدہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بہار کے ہنگامے اور بدلیوں کی کثرت میں توبہ تو گم ہو گئی کہیں پتہ نہیں لگتا۔ یہ وقت عیش و نشاط ہے اسوقت اُسکی تلاش کا موقع ہے

اے مومن آپ کب سے ہوئے بندۂ بتاں باسے ہمارے دین میں حضرت بھی آ گئے

ع۔ کند ہمجنس با ہمجنس پرواز۔ ہر شخص دنیا میں اپنا ہمخیال ڈھونڈھتا ہے اور جب اسکو کوئی مل جاتا ہے تو بڑی مسرت ہوتی ہے۔ اسی طرح تم سمجھ لو کہ اک آزاد منش آدمی کوئی بتاں میں مومن کو پاکے تعجب کے ساتھ پوچھتا ہے کہ حضرت آپ کدھر تشریف لائے آپ تو ان باتوں سے کنارہ تھے مسجد تھی اور آپ کی خدا پرستی یہ بتوں کے بندے ہو کے بندگی کب سے اختیار کی۔ خیر شکر صد شکر کہ ہمارے دین کو اختیار کیا۔ لیجئے قشقہ کھینچیے۔ ناقوس بجایئے۔ اور دیر میں بتوں کو سجدہ کیجئے

اُس کوچہ میں جا مرینگے مدد اے ہجوم شوق آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم

ذی شخص کو کسی کار مشکل کے انجام دینے میں طاقت صرف کرنیکی اسقدر ضرورت نہیں ہوتی جتنی کہ ایک کمزور کو ہوتی ہے۔ مقصد شاعر کا یہ ہے کہ اب یہ ٹھانی ہے کہ جسطرح ہو اس کوچے تک اس ضعف میں ہی چلے جائیں چاہے وہاں پہونچ کے مر ہی کیوں نہ جائیں اسلئے اپنی ناطاقتی کے ساتھ ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ خدا مدد کرنے والا اور مجھ بیمار ضعیف پر رحم کرنے والا ہے منزل آسان کر دیگا۔

دن رات فکر جو رہیں۔ کیوں رنج اُٹھانا کب تلک
میں بھی ذرا آرام لوں تم بھی ذرا آرام لو

بنگال والے شعرا تو دیوتا جانتے ہیں۔ اسلام الشعرا تلاندالرحمن کا دعوے

کرتا ہے۔ انگلستان ملٹن کی رائے ہی اتفاق کرتا ہے جو شعر میں جوش و اصلیت نہیں تو کچھ نہیں۔ ان باتوں کو مدنظر رکھ کے محسوسات کو معقولات پر ترجیح دیتے ہوئے ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ مومن نے یہ شعر ایسا لکھا جسمیں بنگال اور عرب بلکہ انگلستان تمام کے باشندوں کی پسندیدگی کا جوہر موجود ہے وہ کہتے ہیں۔ رات دن فکر جور نو ایجاد میں خواہ مخواہ کیوں اپنے کو خبط کئے ہو آخر دماغی محنت تمہیں پاگل بنا کر چھوڑے گی۔ میری رائے ہو کہ رنج نہ اٹھاؤ بلکہ اب (آرام) لو کہ دماغ ٹھکانے آجائے اور میں بھی رنج سہتے سہتے خوگر رنج ہو گیا ہوں اور چونکہ رنج کی حس نہیں ہوتی اسلئے ذرا آرام لوں۔ اسکے بعد تمہیں بھی ظلم کرنے میں اور مجھے بھی مظالم کے سہنے میں لذت حاصل ہوگی۔ اس سے بہتر اور نیچرل شاعری کیا ہوگی۔

میر تقی میر بھی اسی انداز کو مدنظر رکھ کے فرماتے ہیں کہ ؎

ضعف بہت ہے میر تمہیں کچھ اسکی گلی میں مت جاؤ صبر کرو کچھ اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو

ربط اس سے ہے مثل شعلہ و شمع مر جاؤں گر اک دم جدا ہوں

عجب مسئلہ اس شعر میں حل کرتے ہیں جسطرح وہ کیڑا جسکو سمندر کہتے ہیں آگ میں رہنے سے زندہ رہتا ہے باہر آیا اور مر گیا۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ میرا اسکا ساتھ شعلہ و شمع کا سا ہے شعلہ اگر چاہے کہ شمع سے الگ ہوکے باقی رہیں تو فوراً کافور ہو جائے۔

کس کی خبر ہے آنے کی۔ کس لئے ہے یہ بیتابی

کس لئے ہیں ہم ہر دم پھرتے۔ آتے اور جاتے ہیں

ایسے ہی اشعار سہل ممتنع کہے جاتے ہیں کہ دیکھنے میں صاف مگر کہنا مشکل وہ فرماتے ہیں کہ آخر یہ کسکی آمد میری بیتابی کو بڑھائے ہوئے ہے کہ ہر دم بیچین ہو کے ہم دوڑتے پھرتے ہیں کبھی گھر سے باہر جاتے ہیں اور کبھی باہر سے اندر آتے ہیں کھلتا نہیں کہ کسکے انتظار نے کسکے وعدہ نے اس گت پر پہونچا رکھا ہے شاید وہی آرہے ہیں

میر تقی صاحب فرماتے ہیں کہ ؎

وہ دیکھنے ہمیں ٹک بیماری میں نہ آیا
سو بار آنکھیں کھولیں بالیں سے سر اٹھایا

ہائے اس بوڈھے نے تو مار ڈالا۔ کیا کہتا ہے کیا کیا نقشے کھینچتا ہی سبحان اللہ سبحان اللہ خیر کہنا یہ ہی کہ مومن نے اپنے شعر میں جس آب و رنگ سے کام لیا ہی اے کاش وہ ایسے سو دو سو شعر بھی لکھجاتے تو یہی کہا جاتا کہ میر صاحب پھر مومن کے روپ میں آسمان سخن سے اترے ہیں۔

تو کہاں جائیگی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہونگے

یہ شعر بھی لذتِ درد میں ڈوبا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہمکو اپنے سے زیادہ غم تو اے شبِ ہجراں تیرا ہے آگے تو جب تیرا جی چاہتا تھا آکے میری مہماں ہو جاتی تھی اب تو یہ فیصلہ ہی کہ کل ہم خوابِ عدم میں ہونگے پھر تو کسکے گھر جائیگی اور کون تجھے پوچھیگا۔ کہنے کو تو داغ نے بھی اک شعر قریب قریب اسی انداز میں کہا ہے مگر استغفر اللہ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا ؎

کہیں دنیا میں نہیں اسکا ٹھکانا اے داغ
چھوڑ کر مجکو کہاں جائے مصیبت میری

ذوق بھی مومن کو نہ پا سکے بہ داغ چہ رسد۔

عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو
کہ شبِ غم کوئی کس طرح سحر کرتا ہے

یہی وہ درد ہے جس سے غالب کا دیوان محروم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شبِ غم کسطرح تیرا عاشق مر مر کے سحر کرتا ہے اسکی خبر اسکو کیا جو کبھی شبِ وصل عیش میں بھی جاگا ان باتوں کو وہ جانیں جنھے راتیں جاگ کے کاٹی ہوں۔ یعنی بقول غالب ع

صبح کرنا شام کا۔ لانا ہے جوئے شیر کا

اب یہ حالت ہو کہ اے پردہ نشیں
تجھسے احباب چھپاتے ہیں مجھے

آہ جملہ پر دیکھو سوز و گداز ہی نظر آتا ہے۔ یہ فرماتے ہیں کہ ہائے میری حالت تیری عشق میں

یہاں تک نوبت ہوگئی کہ جب ذکر میرا تیری بزم میں آجاتا ہے تو احباب اخفائے راز کے خیال سے اظہار حال کرنا یا میرے گھرا کے مجکو بستر مرگ پر دکھانا نہیں چاہتے اس لئے کہ تو بیچین ہو جائیگا ۔ یہاں پردہ نشیں کے مقابلہ میں چھپا بجز مومن کون لکھ سکتا تھا اس اقلیم بیاں پر ازل سے انہیں کا قبضہ ہے ۔

بسکہ اک پردہ نشیں سے دل بیمار لگا　　جو طبیبوں سے چھپاتے ہیں وہ آزار لگا

وہی مسئلہ ۔ پردہ نشیں اور چھپانے کا بیش ہو مگر بیان بدلا ہوا ہے یہاں کہتے ہیں کہ ہائے قسمت دل بھی لگا تو اک پردہ نشیں سے ۔ مرض بھی ہوا تو عشق و محبت کا جسکو لوگ طبیب تک پر ظاہر نہیں کر سکتے ۔ اب امید شفا کیا رکھیں ۔ اسکا محال اور موت اسمیں لازمی چیز ہے ۔

مومن سوئے شرق اس بت کافر کا تو گھر ہے　　ہم سجدہ کدھر کرتے ہیں اور کعبہ کدھر ہے

مومن کہتے ہیں کہ جب عشق بت کافر ہے تو پھر سجدہ اپنے کعبۂ مقصود کی طرف کیوں نہیں کرتا کیونکہ آفتاب پرست سوئے شرق سجدہ سلام کرتے ہیں تیری ترکیب الٹی ہے کہ عرض یورپ کے مسلمانوں کی طرح مشرق کی طرف سجدہ کرتا ہے ۔ اور امید رکھتا ہے کہ یہ سجدہ قبول ہوگا ۔ اسے میاں اسکا رام ہونا معلوم

مومن تم اور عشق بتاں اسے پیر و مرشد خیر تو ہے

یہ ذکر اور منہ آپکا صاحب خدا کا نام لو

خدا کا نام لو ۔ محاورہ یہ اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جیسے کوئی کہے کہ کہاں ہو ۔ کیا بکتے ہو ہوش میں آؤ ۔ اسی طرح پیر و مرشد بھی لوگ شفیق حالم اور مہربانم کیجگہ مذاق سے بولتے ہیں خیر تو فرماتے ہیں کہ عشق الہی کو تو جانے دو اجی تمسے عشق بتاں کا حق تو ادا ہی نہیں ہو سکتا ہے یہ ذکر اور آپکا منہ ۔ خدا کی شان پہلے بتوں کے ذکر کے قابل تو ہو لو پھر ذکر حق کرنا ۔ مجازمیں قدم ہی نہیں رکھا حقیقت کی تلاش ہوگئی ۔

اب ہم بہ تقلید دیگر ذیل کے تین اشعار پیش کرکے تنقید کی بہار دکھاتے ہیں۔ سنئے

میر — میرے تغیر حال پر مت جا — اتفاقات ہیں زمانے کے

درد — میرے تغیر حال پر مت جا — یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے

مومن — میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ — تجھکو اپنی نظر نہ ہو جائے

ایک شاعر کہتا ہے کہ یہ سب اتفاقات ہیں جو میرا حال بگڑ گیا۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرے حال کے تغیر پر تعجب نہ کر مہربان من ایسا ہوتا ہے۔ مومن کہتے ہیں کہ میرے تغیر رنگ پر غور مت کر اگر غور کریگا تو تجھکو اپنی نظر آپ ہو جائیگی اسلئے کہ یہ تیرے ہی عنایات کے بدولت ہوا ہے۔ جب تو اسکو محسوس کرلیگا اور سمجھ لیگا کہ تجھکو وہ قوت حاصل ہے کہ انقلاب پیدا کرکے عالم اجسام کی ہستی کو بھی نیستی تک پہونچا دے تو تجھے اپنی نظر آپ ہو جائیگی۔ ناظرین خود انصاف کردیں کہ نزاکت مضمون کس شعر میں ہے۔

خوشی نہ ہو مجھے کیونکر قضا کے آنے کی — خبر ہے لاش پہ اس بے وفا کے آنے کی

موت کے آنے سے کون ڈرتا ہے آ مجھے مسرت ہے یہ اسلئے کہ اس نے عہد کرلیا ہے کہ میرے جیتے جی نہیں آئینگے جب تو مرجائیگا تب آئینگے اسلئے انکا آنا میری موت کے آنے پر منحصر ہے۔ اب میں کہتا ہوں کہ جھوٹوں کے قول کا کیا اعتبار کہیں مرکے پچتانا نہ پڑے۔

میں اگر آپ سے جاؤں تو قرار آ جائے — پر یہ ڈرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو یار آ جائے

اس شعر کی ترکیب کو کیا کہئے۔ بس یہ مومن کا کام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ سے جاؤں یعنی بیہوش ہو جاؤں تو بیہوشی کے سبب تکلیف درد دل تو عدم محسوس کے سبب ضرور جاتی رہیگی۔ مگر ڈر تو یہ ہے کہ اگر اسی وقت یار آگیا تو میں اسکو دیکھ نہ سکوں گا نہ اس سے باتیں کرسکونگا اس سے اچھا ہے کہ بیقرار ہی رہوں۔ دنیا امید پر قایم ہے شاید وہ آہی جائے۔

وعدہ کرکے وہ نہ آتے نامہ بر تو نے پوچھا ہوئیگا تکرار سے

وعدہ کرکے وہ اور نہ آئے یہ کوئی بات ہے اس سے زیادہ سچا تو دنیا میں کوئی ہو نہیں اب رہ گئی یہ بات کہ اے نامہ بر تو نے بار بار وعدہ لیا ہوگا اسلئے وہ چڑھ گیا اور نہیں آیا یہ قصور تیرا ہے کہ اسکا؟ ہاں خانصاحب ہاں جھوٹی لٹ کیس آپ کو قابو کی چیز ہے کر لیجئے ۔ رر

جا بجا نہریں ہیں جاری میں نے اشک پوچھے ہونگے دامنِ کہسار سے

یہ لکھنو کا انداز اور استعارہ شاہ نصیر صاحب کی درگاہ کا تبرک ہے ۔ مطلب تو شعر کا یہی اتنا ہے کہ پہاڑوں کے دامن میں نہریں کہاں سے آسکتی تھیں میں نے عالم وحشت میں رو رو کے ان کے دامن سے آنسو پوچھا ہے ۔ اس رنگ سے غالب بھی خالی نہیں ہیں ؎

آنکھ کی تصویر سر نامہ پہ کھینچی ہے کہ تا تجھ پہ کھل جائے کہ اسکو حسرتِ دیدار ہے

بہرحال اس رنگ کے اشعار سے تو ذوق بھی نہیں بچے ؎

ہائے رے حسرتِ دیدار کہ ہاتھوں کو بھی لکھتے ہیں ہائے دو چشمی سے کتابت والے

مگر قول فیصل یہ ہے کہ اگر یہی مستقل رنگ مومن و غالب کا ہوتا تو بندہ کا سلام ناسخ کے دامن کی ہوا سے میر کا گلشن بھی خالی نہیں ہے ؎

مردمِ دیدہ تر مردم آبی ہیں مگر رہتے ہیں روز و شب شام و سحر پانی میں

بہرحال یہ وقت کا اثر ۔ استاد تسلیم اپنی آنکھوں کی دیکھی ہوئی فرماتے تھے کہ لکھنو میں پھٹے گریبان کا بیابان والا وہ مشاعرہ دیکھا تھا جس میں ۔ لال کھاروے کی لنگ اور ڈھاکہ کے ململ کا کرتا پہنے ہوئے ناسخ اک سبز مخمل کی مسند پر بیٹھے تھے ۔ پھولوں کا پنکھا ہاتھ میں تھا یہ سب شعر اسی مشاعرے کے ہیں ۔

؎ ناسخ مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

؎ وزیر — نہیں ہے انبوہ خط میں جلوۂ حسنِ رخِ جاناں کا
عیاں ہے تخت پہ پریوں کی جھرمٹ میں سلیماں کا

؎ اسیر — ازل سے سلسلہ ہے اس جنونِ فتنہ ساماں کا
شگافِ خامۂ کُن چاک ہے میرے گریباں کا

؎ آتش — لبھاتا ہے نہایت دلکو خطِ رخسارِ جاناں کا
گھسیٹے گا مجھے کانٹوں میں سبزہ اس گلستاں کا

؎ تسلیم — لکھا ہے یکقلم مضمون صنعت ہائے یزداں کا
جوابِ دفترِ کُن ہر ورق ہے میرے دیوان کا

اسی موقع پر نسیم دہلوی نے یہ اشعار پڑھے تھے۔ وقت کے اثر سے دلّی کے سفید پوشوں کے دامن پر بھی دو چار چھینٹیں اس رنگ کی موجود ہیں دیکھ لو۔

؎ نسیم — اثر پیدا کیا ہے پیرہن نے جسمِ عریاں کا
نہیں دیتا ہے تک زخمِ نو چاکِ گریباں کا

ہٹا تو ابرِ گیسو جلوۂ عارض میں فرق آیا
نقابِ شام سے منہ چھپ گیا صبحِ گلستاں کا

داغ کو ہزار ہزار آفریں جو اس ہنگامہ کو رامپور میں رات دن دیکھ رہا تھا مگر لکھنؤ والوں سے بالکل الگ کے دلّی کے نام کو روشن کرتا رہا اور اُسیکو حالی نے لکھا تھا کہ ؎

داغ و مجروح کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

میرے سینے پہ قدم زور سے مت رکھ ظالم
ہاں نہ چبھ جائیں کفِ پا میں کہیں دل کے خار

لے سبحان اللہ کیا نازک خیالی ہے کہتے ہیں کہ ہاں ہاں میری چھاتی پر قدم زور سے مت رکھ تیرے تلوے اے نازنیں بڑے ملایم ہیں کہیں انمیں خارِ غم نہ چبھ جائیں۔

غالب کی ہمنوائی بھی ملاحظہ کر لیجیے وہ پاؤں کی نزاکت کو فرماتے ہیں کہ ؎

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پاؤں

بارک اللہ کیا کہنا۔ غالب نے غلو سے کام لیکر شعر کو مومن سے زیادہ بلند کر دیا ہے مگر بیان کی لطافت جو مومن میں ہے وہ غالب میں نہیں۔ آمد اور آورد کا فرق ظاہر ہوتا ہے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہونگے

اس پھر کی تکرار نے شعر کے لطف کو بڑھا دیا ہے۔ اور اندازِ بیان بھی مستانہ ہے۔
مطلب تو صاف ہے اور اسی قدر ہے کہ صبر و سکون کے نام الوداعی فاتحہ پڑھ کر

پھر بہار آگئی۔ اب پھر وہی دشت نوردی اور پھر ہمارے وہی تلوے اور ببول کے کانٹے ہونگے۔

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی
ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

یعنی او ناصح سمجھ کے نصیحت کر مرے بندِ غم کو نہ توڑ کہ اسی کی بقا تک مجکو بقا ہے۔ ورنہ جہاں اس سے چھوٹے پھر ہم ہیں اور فنا ہے۔ غالب بھی اسی بندِ غم کو لکھتے ہیں ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

فرق ان دونوں شعروں میں اتنا ضرور ہے کہ مومن کی ترکیب پیچیدہ ہے اور غالب نے نئی روشنی اور پسندیدگی کو مدِ نظر رکھ کے جو کچھ لکھا ہے عام فہم ہے۔

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے
کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

گھر میں رہ کے صبر کرنا چاہا تو جذباتِ عشق نے جنوں پیدا کر دیا یہاں تک کہ گھبرا کے صحرا میں چلے آئے اب جو یہاں آئے ناصح ہی صبر سے کام لینے کو کہتا ہے تو ڈرتا ہوں کہ صحرا بھی گھر کی طرح وحشت زدہ نہ ہو جائے پھر بڑی مشکل ہوگی۔ یہاں سے کہاں جائینگے

سنا اس نے مرا نالہ اثر بھی کچھ ہوا شاید
کہ دشمن کہہ گیا بے فائدہ کیوں غل مچاتا ہے

ہاں واقعی قرین قیاس ہے اس نے آنجناب کے نالہ کرتے ہوئے ضرور سنا اور اس کے دل میں کچھ اثر بھی ہوا یہاں تک کے اس نے آپکے رقیب سے پوچھا کہ کس دردمند کی آواز ہے مگر جب دشمن نے یہ دیکھا کہ کہیں وہ مسخر نہ ہو جائے تو آپ سے یہ آکے کہتا ہے کہ کاہے کو غل مچا رہا ہے فضول کوئی سننے بھی غرض رکھے علاوہ اپنے گوش کیا رکھتے آپ اپنی ہی سعی کئے جا رہئے۔

خیالِ خوابِ راحت ہو علاج اس بدگمانی کا
وہ کافر گور میں مومن مرا سنتا نہ ہلاتا ہے

یعنی اسکو یقین موت کہاں ہے مومن جو جب نہ میری موت پر یقین کرے وہ تو کافر ہے یہ سمجھ رہا ہے کہ مکاری سے اس نے آنکھیں بند کر لی ہیں خیر قسم بھی کھا چکا ہے

پڑے رہو علاج اس بدگمانی کا بس یہی ہے کم سے کم وہ شانہ تو ہلا رہا ہے۔ اگر مر گئے ہو تو بھی مبارک زندہ ہو تو بھی مناسب۔

خیالِ اجل سے تسلی کروں
وہ طاقت بھی جانِ حزیں ہو چکی

اسی ضعف کو لکھنؤ والوں نے کس کس طرح لکھا ہے اور رائی کو پہاڑ بنایا ہے مگر بجز بلاغت لطف نہیں واد نہیں مومن کا مقصد یہ ہے کہ طاقتِ جان ناتوان یہاں تک زائل ہو چکی کہ اب اسمیں اتنی بھی قوت نہیں کہ کم سے کم وہ موت کے آنے کا تصور کر سکے اور اسی آس پر زندہ رہے۔

کیونکر نہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے
کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

صاحب یہ منہ کہاں جو کہیں کہ ہم دشمنوں کی خوشامد نہ کرینگے۔ برا ہو اس عشق کا کیا کیا نہ کیا اور جانیں ابھی اور کیا کیا کرینگے۔

مانگا کرینگے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

کیا بلند اور اچھوتا مضمون لکھا ہے فرماتے ہیں کہ جب اثر کو میری دعا کے ساتھ دشمنی چلی آتی ہے تو اب ہمیں بھی ضد ہے بعوض وصلِ یار کے ہم بھی ہجرِ یار کی دعا مانگا کرینگے کہ نتیجہ برعکس ظاہر ہو یعنی بعوض ہجر وصلِ یار حاصل ہو جائے۔ اور اس الٹ پھیر میں اپنی بات بن جائے۔

حضراتِ ناظرین۔ ان افسانوں کو آپ کہاں تک سنینگے۔ اختصار کو مدِنظر رکھ کے ان چند شعروں کی تنقید و تشریح کر دی ہے ورنہ

جو اس زور سے میر روتا رہیگا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہیگا

دنیا خالی نہیں۔ خدا نے بہتر سے بہتر دماغ والوں کو پیدا کیا ہے وہ اس کام کو مجھ سے زیادہ اچھا کر کے دکھلا سکتے ہیں مگر ہاں جو اہلِ انصاف ہیں وہ انشاء اللہ یہی کہینگے کہ

حسن تو نے لکھی جو یہ مثنوی
نہ ایسی ہوئی ہے نہ ہوگی کبھی

اچھا اب لگے ہاتھوں مومن کی روح پاک کو اک سورۃ فاتحہ کا ثواب پہونچا دیجئے اور انکی ان چند غزلوں کو بھی سن لیجئے۔ جنکو مطبوعہ کلیات سے لیا ہے۔

جوہرِ کلامِ مومن

گر وہاں بھی یہ خموشی اثرِ افغاں ہوگا
حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا

کیونکر امیدِ وفا سے ہو تسلی دل کو
فکر ہے یہ کہ وہ وعدے سے پشیماں ہوگا

درد سے جان کے عوض ہر رگ و پے میں سمائے
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

شومیِ بخت تو ہے چین سے لائے وحشتِ دل
دیکھ زنداں بھی کوئی دن میں بیاباں ہوگا

نسبتِ عیش سے ہوں غنچۂ گریاں یعنی
ہے یہ رونا کہ دہن گور کا خنداں ہوگا

دوستی اس صنمِ آفتِ ایماں سے کرے
مومن ایسا بھی کوئی دشمنِ ایماں ہوگا

ٹانکنے چاکِ گریباں کو تو ہر بار لگا
ہاتھ کٹواؤں جو ناصح رہے اک تار لگا

جذبۂ دل کو نہ چھاتی سے لگاؤں کیونکر
آپ وہ میرے گلے دوڑ کے یکبار لگا

دیکھ تو حسرتِ دیدار پسِ مرگ بھی
آنکھیں وہ کھول کے تکنے در و دیوار لگا

کعبے سے جانبِ بتخانہ پھر آیا مومن
کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

ذیل کی غزل تو روزمرہ اور زبان کے لحاظ سے ایسی لکھی ہے کہ صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مومن امۃ الفاطمہ بیگم عرف صاحب جی کے سامنے بیٹھے ہوئے رو رہے ہیں اور یہ اشعار پڑھ رہے ہیں۔ انگلیوں کی کنگھی زلفوں میں چل رہی ہے اور وہ خاموش بیٹھی ہوئی انکا منہ دیکھ رہی ہیں۔ اللہ اللہ اس تصویر کو کھنچے ہوئے اک صدی گذرنے آئی مگر رنگ و روغن نہ بگڑا۔

غزل

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو | وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پہ | مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں | وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم | گلۂ ملامت اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی | کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا | سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی مرے دل سے صاف اتر گئی | تو کہا کہ جانے مری بلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ کہتے تھے باوفا جسے آپ کہتے تھے آشنا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اس پری وش سے لگاتے ہیں مجھے | لوگ دیوانہ بناتے ہیں مجھے

یارب ان کا بھی جنازہ اٹھے | غیر اس کوچے سے اٹھاتے ہیں مجھے

حیرت حسن سے یہ شکل بنی | کہ وہ آئینہ (الٹا) دکھاتے ہیں مجھے

جان گئی پر نہ گئی جور کشی | بعد مردن بھی دباتے ہیں مجھے

مومن اور دیر خدا خیر کرے
طور بے ڈھب نظر آتے ہیں مجھے

غزل ذیل کی ردیف زبان قدیم سے وابستہ ہے مگر جو لطف اسکا صاحبان طبع سلیم کو آج بھی میسر ہے وہ زبان حال میں اسکا حاصل نہیں ہو سکتا ہے انداز غزل اتنا پاکیزہ ہے جیسے ابھی گلاب کے درخت میں پھول کھلے ہیں اور اسکی خوشبو سے سارا باغ معطر ہو رہا ہے اسکی نگینیوں پہ بلبلیں لوٹ رہی ہیں۔

غزل

لہ یعنی ذرا صورت شریف ملاحظہ فرمائیے

ہے نگاہِ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے
یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے

حالِ دل کیونکر کہوں میں کس سے بولا جائے ہے
سر اٹھے بالیں سے کیا کچھ جی ہی بیٹھا جائے ہے

جان نہ کیا وصلِ عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں
جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

رشکِ دشمن نے بنا دی جان پر اے بے وفا
کب تلک کوئی نہ بگڑے حال بگڑا جائے ہے

حسنِ روز افزوں پہ غرہ کس لئے اے ماہرو
یوں نہیں گھٹتا جائے ہے جتنا کہ بڑھتا جائے ہے

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں
کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

تاب و طاقت صبر و راحت جان و ایمان عقل و ہوش
ہائے کیا کہئے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے

خاک میں مل جائے یارب بیکسی کی آبرو
غیر میری لاش کے ہمراہ روتا جائے ہے

دیکھئے انجام کیا ہو مومنِ صورت پرست
شیخ صنعا[1] کی طرح سوئے کلیسا جائے ہے

تقریظ و تاریخ

تقریظ از گوہر سخن بابت دریائے علم و لیاقت عزیز بیگم صاحبہ دہلوی

ہوا خواہانِ چمنستانِ سخن کو مژدہ کہ میر بہار ادیب روزگار حضرت مولانا عرشؔ نے سالہا سال کی جانکاہی کے بعد ہمارے دادا جان فخرِ ہندوستان حکیم مومن خاں دہلوی کے صحیح حالات تاریخ مومن نام اک کتاب میں مرتب کر کے اسکو [illegible] صاحب ہنر سخندان و سخنور ارسطوئے دوراں حکیم محمد جمیل خاں صاحب خلف مسیح الملک حکیم اجمل خاں مغفور دہلوی کے نام معنون فرمایا ہے۔

خدا لگتی کہونگی کہ اگر اظہارِ حالاتِ غالب و ذوق کے لئے حالی و آزاد آئے تھے تو خداوند عالم نے عرش سے نکتہ فہم کو مومن کے انکشافِ کمالات کے لئے بھیجا ہے۔

[1] ایک بزرگ مشہور کا نام ہے جو سیکڑوں مرید رکھتے تھے مگر عشقِ دخترِ ترسا کے بدولت منکرِ اسلام ہو جاتے اگر مریدین انکی ...

ذرا دیکھیئے گا کس انداز کی دلکش تحریر سے کس اچھوتے عنوان سے اشعار مومن کی تشریح و تنقید کی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ لوہے کے چنے چبائے ہیں تعریف نہیں ہو سکتی حاسد منہ میں گھنگنیاں نہ بھر کے بیٹھیں تو کیا کریں۔ گھر بیٹھے دعویٰ کرنا اور بات ہے مگر جو انصاف کی عینک لگا کے دیکھو تو چہ نظم و چہ نثر عرش کا جواب بہار اور بنگال میں نہیں ہے اور یہ پورب کے ایک باشندہ کا معمولی کارنامہ نہیں کہ میر انیس کا خاندان لکھنؤ میں اور حکیم شریف خاں کا خاندان دہلی میں اُسکی زباندانی اور کمالِ فن کا معترف ہو جو سچ پوچھو تو ؎

ہوا کرتی ہے زینت عیب سے رنگیں مزاجوں کی
سدا شبنم دھولا دیتی ہے منہ گلہائے خنداں کا

عرش صاحب کی عنایتوں کا احسان میرے سر آنکھوں پر اور صوبہ بہار کا احسان دلی کیا سارے ہندوستان پر جہاں کے ایک مورخ نے ایسی نادر کتاب لکھی۔ جب سے عرش صاحب نے دلی آ کے تفتیش احوالِ مومن فرمائی میرے داغِ دل کو تازہ کیا ہے ہچکیوں کا ہی تقاضا رہتا ہے کہ ؎

شمعِ بزمِ خاندانِ خاص تو ہی اے عزیز
تربتِ مومن پہ چل آنسو بہانے کے لئے

خدا کرے مومن کے موہوم مزار پر کتبہ بھی لگ جائے اور وہ زیارت گاہِ عالم ہو کر رہے۔ آمین

خاکپائے مومن عزیز بیگم دہلوی

تاریخ ترتیبِ سوانح مومن از اُستادِ کہن سال
عالیجناب مولانا مولوی ناصر حبیب صاحب ناصر وکیل ریاست
دتیا نواسہ حکیم مومن خانصاحب مغفور

ایک مدت سے تھے اربابِ سخن سب منتظر
حضرتِ مومن کے حالات و سوانح کیلیے

عرش نے لکھکر حیاتِ مومنِ مرحوم سے
حسنِ تحقیقِ سوانح کو دکھانے معجزے

دادِ معنی پروری دی ہے بہت اچھی طرح
لکھے ہیں حالاتِ مومن خوب شرح و بسط سے

عرش شاگردِ رشیدِ حضرتِ تسلیم ہیں
وہ نسیمِ دہلوی کے خوشہ چینِ فیض تھے

اور نسیمِ دہلوی نے مومنِ مرحوم کی
خدمتِ اقدس سے پائے تھے یہ عالی مرتبے

مومنِ مرحوم کا ناصر نواسہ میں بھی ہوں
نسبتِ ذرہ ہو اُس خورشیدِ رخشاں سے مجھے

دل نے برجستہ کہا مصرعِ تاریخِ طبع
عرش والا جاہ نے حالاتِ مومن کے لکھے

۱۳۴۸ھ

تاریخ

تاریخ از محققِ بے مثال شاعرِ عالی خیال فخر التلامذہ استادِ تسلیم
حضرت مولانا سید شفیع احمد صاحب عالی ۔ وکیل بدایوں ۔

جناب عرش نے لکھا وہ تذکرہ جس سے ۔۔۔ کھلے بہار پہ نکات حکیم مومن خان
تلاش ہے سن ترتیب کی اگر عالی ۔۔۔ لکھو بیان حیاتِ حکیم مومن خاں

۱۳۴۷ھ

تاریخ از نقادِ فن شمع بزم سخن عالی جناب ضیاء احمد
صاحب بدایونی سابق لکچرار علیگڑھ یونیورسٹی و پروفیسر
حال دہلی کولج (شیدائے مومن)

تاریخِ مومن

۱۳۴۷ھ

عرش نے لکھا وہ نادر تذکرہ ۔۔۔ جس کے تھے مشتاق سب پیر و جواں
تازہ کر دی عظمتِ رفتہ کی یاد ۔۔۔ چھیڑ کر عہدِ کہن کی داستاں
اُس شہِ اقلیمِ فن کا ہے یہ ذکر ۔۔۔ شاعری میں تھا جو یکتائے زماں
مصرعِ تاریخ لکھ دو اے ضیا ۔۔۔ واقعاتِ مومنِ شیریں بیاں

۱۳۴۷ھ

طرزِ مومن سے نہ آگاہ تھے جب تک کہ ظہیر

سچ تو یہ ہو کہ کبھی لطفِ غزل نے نہ دیا

ذوق مومن غالب اپنی اپنی خصوصیتوں میں یکتائے روزگار گذرے ہیں۔ ان کے کلام کی خوبیاں ظاہری بھی ہیں۔ اور باطنی بھی۔ یعنی جو لوگ اس وادی کے رہ نورد اور تازہ وارد ہیں وہ بھی اور جن لوگوں میں سخن سنجی اور سخن فہمی کا ملکہ راسخہ کہنگی مشق و مہارت اور مبداء فیاض کے فیضان سے پیدا ہو چکا ہے وہ بھی انکے کلام کو پڑھتے ہیں اور وجد کرتے ہیں میرے نزدیک ان بزرگان اردو کا ایک دوسرے سے اس طرح موازنہ کرنا کہ ایک کے مقابلہ پر دوسرے کی تنقیص ہو۔ اور ایک کا کمال دوسرے کے کمال کے روبرو دب کے رہ جائے گناہِ عظیم ہے۔ میرے نانا حضرت ظہیر دہلوی مرحوم حضرت ذوق کے شاگرد خاص تھے۔ مگر آج شاگردانِ ذوق میں جو مرتبہ حضرت داغ اور حضرت ظہیر کو فن سخن میں ملا اور جو مقبولیت عامہ ان دونوں کے کلام کو ہوئی وہ بے نظیر ہے حضرت آزاد بھی شاگرد ذوق تھے۔ لیکن نظم و شعران کا میدان نہ تھا، وہ تو نثر اردو کے بادشاہ تھے۔ اور نثر لکھنے میں اتباع آزاد ایک محال و ممتنع چیز ہے آزاد کا طرز بیاں درحقیقت اپنی نظیر آپ ہے، وہ واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں گویا کاغذ کے پردہ پر چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ جو ہر شخص کے روبرو بے نقاب ہیں۔ مثلاً لشکر عالمگیر کی دکن پر چڑھائی کا جو فوٹو کاغذ کے صفحات پر آزاد کے قلم نے پیش کیا ہے، آج کون ہے جو الفاظ نثر میں مصوری کا اس سے بہتر حق ادا کر سکے۔

آسمانِ اردو کا ایک آفتاب، جناب غالب ہیں، غالب عالم معانی و بیان کے شہنشاہ تھے، زمانہ تھا کہ کلامِ غالب کے قدر دان دب کے رہ گئے تھے مگر علومِ مغربیہ کی نئی روشنی

پھیلی، اور لوگوں نے غالب کو پڑھا اور سمجھا تو سر دھنے لگے۔ اور آج غالب کا سکہ ہر قدردان اردو کے دل پر ہے۔ اسی طرح مطلع اردو پر ایک ماہ نیم ماہ جناب مومن ہیں یہ نازک خیالی اور اثر و درد کی بولتی تصویر ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ذوق و غالب و مومن دنیائے اردو کے یہ وہ اقانیم ثلاثہ ہیں، جن کے بغیر اردو، قالب بے جان ہے۔ اور ایک کے مقابلہ پر دوسرے کی ہجو و تنقیص مذہب اردو میں ناقابل معافی جرم ہے ؛

ان سب کا اپنا اپنا رنگ ہے۔ اور اپنی جگہ ان میں ہر ایک بے نظیر ہستی رکھتا ہے؛ مجھے نہایت خوشی ہے کہ جناب عرش گیاوی کی والہانہ کوششوں کی بدولت آج مومن اپنی اصلی شان میں جلوہ گر ہیں، جناب ممدوح کو جو شیفتگی ذات مومن سے ہے وہ جابجا، انکے لکھے ہوئے اس تذکرہ مومن سے ظاہر ہے، سچ تو یہ ہے کہ اپنی عقیدت کیشی کا حق ادا کر دیا ہے، اور مومن کے قدردانوں پر ہی نہیں بلکہ اردو پر احسان کیا ہے

دلی کے بے تاج بادشاہ، اور خاندان حکیم شریف خاں مرحوم کے چشم و چراغ جناب حکیم محمد جمیل خاں صاحب نے جو آج اپنے والد ماجد مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مغفور کی مسند پر صورت و سیرت میں زندہ مسیح الملک ہیں مجھ سے فرمایا، کہ میں اس کتاب کی طباعت کی ذمہ داری قبول کروں، اور میں نے اسے خوشی و فخر کے ساتھ منظور کیا،

جناب حکیم صاحب کا خاندان، ہر مسلک اور ہر خیال کے شرفا کی محبت و عقیدت کا مرکز نہ آج سے بلکہ کئی سو برس سے ہے، غالب ذوق و مومن اور انکے شاگردوں میں سے کون ہے جسے اس خاندان سے محبت کا تعلق نہیں رہا۔ یہ سب کے قدردان ہیں اور سب انکے والہ و شیدا ہیں ؛

اسی تعلق کی بنا پر انہوں نے اس تذکرہ مومن کا اپنے نامِ نامی سے معنون ہونا منظور فرمایا۔

اس تذکرہ میں ایک مقام پر، کامدار خانی، خاندانِ کشمیری سیدوں کے دو خانوادوں کا حوالہ دیتے ہوئے ایک سے مومن کا تعلق اور دوسرے سے مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کا تعلق بتلایا گیا ہے، لیکن جناب مولف کو صحیح اطلاع نہیں ملی، واقعہ یہ ہے، کہ مسیح الملک کا خاندان ساداتِ کشمیر کا خاندان نہیں ہے، یہ خاندان حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کی نسل سے ہے، جنہیں صدیوں تک پیرزادگی کا سلسلہ رہا، اور عہدِ عالمگیری میں، جبکہ دہلی حضرت سید حسن رسول نما قدس سرہ کے فیوض و برکات سے مالا مال تھی، حکیم محمد اکمل خاں، اس خاندان میں وہ بزرگ گذرے ہیں، جو حضرت کے عقیدت مندان با اختصاص میں سے تھے۔

اور اس خاندان میں پہلے طبیب تھے، حکیم محمد اکمل خاں وہی بزرگ ہیں، جنہوں نے زوجہ اول کے انتقال کے بعد، عقد ثانی حضرت کے ایما و اشارہ سے کیا، اور آپ ہی دعا تھی کہ خدا سات پشت تک اس خاندان میں ایسے لوگ پیدا کرے، جو فیض رسانِ عالم ہوں اور فخرِ خاندان۔ آج اس خاندان کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ خاصانِ برگزیدگانِ حق کی دعائیں، کس طرح مقبول و مستجاب ہوا کرتی ہیں پس اس پورے تذکرہ کو میں نے دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہے اور محبت کی نظر سے، نہ کہ تنقید کی نظر سے کیونکہ یہ کتاب مومن کے لئے ایک خراجِ عقیدت ہے جس کا احترام ہر قدردانِ اردو پر واجب ہے، "خاندانِ شریف" کے حسب و نسب کے متعلق یہ صراحت بھی اس لئے کی گئی کہ جب یہ کتاب اس خاندان کے ایک فردِ عالی کے نام سے معنون ہے اور یہ مقام یوں ہی باقی رہا اور مستند اور صحیح تاریخ کی بنا پر اسکی تصحیح نہ کی گئی تو یہ درست کام نہ ہوگا۔ آئندہ مورخین کے لئے دشواری پیدا ہوگی۔ آخر میں عرض ہے کہ مجھے پورا یقین ہے

جناب عرشؔ نے عقیدتِ مومن کا پورا حق ادا کر دیا ہے ہم ان کو مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ قدر دان زبان اور شیفتگان ادب اردو اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

سید اشتیاق حسین شوقؔ نبیرہ حضرت ظہیرؔ مرحوم

تقریظ منظوم حیاتِ مومن

وحید العصر ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائلؔ دہلوی

جاگیردار ریاست لوہارو

مومن علم ہے جس کا ہے سلطان ریختہ — مسکن کا اُسکے نام ہے ایوان ریختہ
روح و رواں غزل کا ہو ایک ایک اُسکا شعر — دیوان اُسکا دیکھو ہے دیوان ریختہ
حالات زیست اُسکے اگر چاہو دیکھنے — دیکھو لگی ہے عرشؔ کی دوکان ریختہ
جو ماہر سیر ہے ادب دان السنہ — نظمی نسق میں عرف ہے سحبان ریختہ
لکھکر سوانح حضرت مومن کی بالخصوص — جاری کیا ہے نثر میں عمان ریختہ
احسان ایک روح پہ فرمایا عرشؔ نے — مضمون جس سے ہو ہیں سخندان ریختہ
معجز نما زبان ہے معجز نگار کلک — ایک ایک لفظ نسخہ ہے ایمان ریختہ
جو حرف اسکا دیکھئے ہے خال مہ جبیں — ہر نقطہ اُسکا مصدر درخشان ریختہ
اہل قلم کو زیب ہے تالیف ایسی ہی — ایسوں کی خامہ سائی ہے شایان ریختہ
تقریظ خواہ نسخہ ہوئے شوقؔ مجھسے آج — پیری میں ہوں میں طفل دبستان ریختہ

نسبت ہے کاملین کی ہوں روشناس خلق
ہمرنگ مور ہو فر سلیمان ریختہ

اصرار نے عزیز کے مجبور کر دیا
طے پا شکستہ کیا کرے میدان ریختہ

خامہ نے میرے کر دیا کچھ التما امر
ہو کر اسیر و قیدی زندان ریختہ

لیکن نہیں مجال کہ ہو ہاتھ کی پہنچ
تا گیسوئے مجعّد و پیچان ریختہ

دیگر دعا یہ کرتا ہے سائل جگر خستہ
مقبول ہو یہ گوہر غلطان ریختہ

قدر اس کی اہل فن کریں قدر اسکا اہل ذوق
دلدادگان عارض خوبان ریختہ

مومن کی یہ حیات ہے عرش کی برات
ہوں مستفید اس سے سخندان ریختہ

اعلان عام

حق تصنیف کتاب ہذا حیات مومن
مع ضمیمہ تاریخ مومن محفوظ ہے کوئی صاحب
بغیر اجازت طبع نہ فرماویں ورنہ قانونی
طور پر جوابدہ ہونگے ۔ سید اشتیاق حسین شوق
دریبہ کلاں دھلی

کاتبہ سید احمد کلیم جہیل لال دروازہ دہلی

فی شیشی خورد تین ماشہ بحوالہ ۹؎ — فی شیشی کلاں چھ ماشہ ایک روپیہ ۲؎

سُرمہ نور العین

سُرمہ نور العین۔ دھند۔ خارش چشم۔ جالا۔ ناخنہ۔ سرخی چشم۔ ڈھلکا۔ پربال۔ ضعف بصارت اور روہوں کی تکلیف کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ دہلی کے مشہور حکما اور وید صاحبان نے تجربہ کرکے سارٹیفکیٹ دیئے ہیں جن کے اسمائے گرامی ذیل میں درج ہیں۔ اسکے علاوہ اسکے بہترین فوائد کیوجہ سے دہلی اور لکھنؤ کے دواخانجات نے بھی اسکو فروخت کرنا شروع کردیا ہے جو اسکے مفید ہونے کا کافی ثبوت ہے ضرور طلب فرمایئے اور فائدہ اٹھایئے۔ حسب ذیل پتہ سے طلب فرمایئے۔

ہندوستانی دواخانہ دہلی

جو عالیجناب مسیح الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب کی سرپرستی میں ہے اور جس کی آمدنی "آریوویدک اینڈ یونانی طبی کالج" پر صرف کیجاتی ہے۔ اسی سبب سے ہندوستان کے بڑے دواخانہ سے بھی یہ چیز دستیاب ہوسکتی ہے جو اسکے اعلیٰ فوائد کا بجائے خود ایک سچا اشتہار ہے۔ ہندوستانی دواخانہ دہلی میں فروختگی کے لئے کوئی چیز قبول نہیں کی جاتی۔ تاوقتیکہ اسکے فوائد اس دواخانہ کی شہرت اور عزت کے مناسب حال ثابت نہیں ہوجاتے۔ اسمائے گرامی اُن حکماء کے جن کے سارٹیفکیٹ ہیں

شمس الاطباء حکیم غلام کبریا خانصاحب شاہزادہ مسیح الملک بہادر

افتخار الحکماء عالیجناب حکیم عبدالغنی خان صاحب	رئیس الاطباء عالیجناب حکیم ناصر الدین احمد خان آنریری مجسٹریٹ
امام الحکماء حکیم احمد علیخانصاحب آنریری مجسٹریٹ	ممتاز الحکماء حکیم محمد یعقوب خان صاحب
عالیجناب وید رادھا بلبھ صاحب	عالیجناب وید چھوٹے لال صاحب

اشرف الحکماء عالیجناب حکیم محمد ظفر خانصاحب خلف عالیجناب حاذق الملک بہادر مرحوم

نوٹ:۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں ایجنسیاں قائم ہوچکی ہیں۔ ہر جگہ خرید فرما سکتے ہیں

المشتہر

موجد سید اشتیاق حسین شوق دریبہ کلاں۔ دہلی